دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ
معارف

جلد نمبر ۱۹۰ ماہ محرم الحرام ۱۴۳۴ھ مطابق ماہ نومبر ۲۰۱۲ء عدد ۵

فہرست مضامین

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

شذرات

اس مہینہ میں علامہ شبلیؒ کی وفات اور دارالمصنّفین کی تاسیس پر ۹۸ سال پورے ہوجائیں گے۔ ہماری علمی اور فکری تاریخ میں ان واقعات کی جو اہمیت ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ گذشتہ کئی نسلوں کے ملی تشخص کی تشکیل وتعمیر اور ان کے لیے فکری غذا فراہم کرنے کے سلسلہ میں دارالمصنّفین کے لٹریچر نے جو گراں قدر خدمت انجام دی ہے برصغیر کی تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ اسلام اور تاریخ اسلام کے خلاف مغرب کے اعتراضات اور زہر افشانیوں کا علمی اور تحقیقی سطح پر جواب دینے کا شرف بھی دارالمصنّفین کو حاصل ہے۔ مسلمانوں کو اپنی تاریخ سے جوڑنے کا کارنامہ بھی دارالمصنّفین کے اکتسابات میں شامل ہے۔ اس کے معماروں کو اس حقیقت کا ادراک تھا کہ اپنی تاریخ سے بیگانہ ہوجانے والی قوم کی مثال جڑ سے کٹے ہوئے درخت کی ہے جو بالآخر سوکھ جاتا ہے۔ بدترین حالات میں بھی تاریخ نے مسلمانوں کو حوصلہ بخشا ہے اور ان کے دلوں میں امید کے چراغ کو روشن رکھا ہے۔ اغیار حوصلہ اور امید کے اس سرچشمہ سے ان کا رشتہ کاٹ دینا چاہتے تھے۔ دارالمصنّفین کے لٹریچر نے نہ صرف اس سازش کو ناکام بنادیا بلکہ مسلمانوں کے دل و دماغ میں اپنی تاریخ سے وابستگی کا شعور بیدا کیا اور اپنے اسلاف کے کارناموں پر فخر کا احساس بیدار کیا۔ یہ سب کچھ جس سطح، جس انداز، جس معیار اور جن حالات میں کیا گیا اسے غیر معمولی ہی کہا جاسکتا ہے۔ دارالمصنّفین کو ڈاکٹر ذاکر حسین نے سراج منیر کہا ہے اور ''نفس مضمون کی معروضیت، لہجے کے اعتدال، زبان و بیان کی سلاست کے علاوہ اور ان سے بھی زیادہ قلب ونظر کی وسعت'' کو اس کے لٹریچر کی خصوصیات میں شمار کیا ہے۔ یہی علامہ شبلی کا مشن تھا۔ اس مشن کی تکمیل دارالمصنّفین نے جس طرح کی وہ کسی بھی ادارہ کے لیے قابل فخر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عہد جدید میں مسلمانوں کی علمی اور فکری تاریخ میں دارالمصنّفین کا کردار غیر معمولی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ موجودہ حالات میں اس کردار کو مزید فعال اور موثر بنانے کی ضرورت پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی ہے۔

دارالمصنّفین نے اعلیٰ درجہ کا لٹریچر ہی تیار نہیں کیا بلکہ اس کی پیش کش کا انداز اور معیار بھی وقت کے پیمانوں کے لحاظ سے اعلیٰ ترین تھا۔ یہاں کی مطبوعات نے حسنِ طباعت کا ایک نیا معیار قائم کیا تھا۔ سیرت النبیؐ کے پہلے ایڈیشن کو دیکھ کر آج بھی آنکھیں روشن ہوجاتی ہیں، دارالمصنّفین ایک مدت تک اپنی مطبوعات کو اسی رنگ اور آہنگ میں پیش کرتا رہا۔ پھر گردش روزگار نے اسے ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کیا جہاں اسے ضروری وسائل کی بھی کمیابی ہی نہیں نایابی کا سامنا کرنا پڑا اور اس عظیم ادارہ کے لیے اپنی کتابوں

کو صاف ستھرے انداز میں شائع کرنا بھی ممکن نہیں رہا۔ بدلتے وقت کے تقاضوں کے مطابق کتابوں کی اشاعت کے لیے درکار وسائل اس کی دسترس میں نہ رہے۔ کچھ دنوں پہلے جب دارالمصنّفین کی تعمیر نو کی مہم شروع کی گئی تو فطری طور پر اس کی شہرۂ آفاق کتابوں کی معیاری اشاعت کو اولین ترجیحات میں شامل کیا گیا۔ یہ ایک مشکل اور طویل المیعاد کام تھا۔ دوسو سے زیادہ کتابوں کی وقت کے تقاضوں کے مطابق معیاری اشاعت کے لیے جن وسائل کی ضرورت تھی وہ ہنوز ناپید تھے اور انتظار کا وقت نہیں تھا۔ چنانچہ اکیڈمی کے دوسرے کاموں کی طرح اسے بھی متوکلاً علی اللہ شروع کر دیا گیا اور تمام تر موانع اور مشکلات کے باوجود بفضلہٖ اب بھی جاری ہے۔ مشکلات نے عزم و حوصلہ کے لیے مہمیز کا کام کیا۔ راستے میں بڑے نشیب و فراز آئے لیکن رفتار سفر سست نہیں ہونے پائی۔ اس کا کسی قدر اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ گذشتہ چار برسوں میں اکیڈمی ۱۲۰ سے زیادہ کتابوں کو نیا قالب دینے میں کامیاب ہوچکی ہے۔ جن حالات میں یہ کام کیا گیا ان کو دیکھتے ہوئے یہ ایک غیر معمولی کامیابی ہے۔ اگرچہ ہم ابھی تک اس سلسلہ میں اپنے معیار مطلوب کو حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے ہیں لیکن اللہ کے فضل و کرم سے اکیڈمی کی نئی مطبوعات کو کسی بھی اچھے ناشر کی کتابوں کے ساتھ رکھا جاسکتا ہے۔ ان میں اکیڈمی کے سرمایہ افتخار سیرت النبیؐ کا نہایت خوبصورت ایڈیشن بھی شامل ہے۔ الفاروقؓ اور سیرت عائشہؓ کو اس پروگرام کے پہلے مرحلہ میں شائع کیا گیا تھا۔ انہیں اب دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ محض اللہ تعالیٰ کے بے پایاں فضل و کرم کی وجہ سے ممکن ہوسکا ورنہ اسباب و وسائل کو دیکھتے اس کا بظاہر کوئی امکان نہیں تھا۔ اتنے بڑے پیمانے پر کتابوں کی اشاعت کے لیے کثیر مالی وسائل کے علاوہ وسیع افرادی وسائل کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ضروری حد تک ان وسائل کے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں اور کئی کمیاں بھی راہ پا جاتی ہیں۔ جن احباب کی انتھک محنت کی وجہ سے یہ کامیابی حاصل کی جاسکی ہے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو بہترین اجر سے نوازے۔ آمین

برصغیر کے اشاعتی منظرنامہ میں سرقہ کی روایت خاصی مستحکم ہوچکی ہے۔ جن اداروں کو اس رسمِ بد سے سب سے زیادہ نقصان پہنچا ہے ان میں دارالمصنّفین کا نام سرِفہرست ہے۔ اس کے مقبول عام لٹریچر کی غیر معمولی مانگ سے فائدہ اٹھانے کے مقصد سے کئی ادارے اکیڈمی کی متعدد کتابیں شائع کرتے رہے ہیں۔ ان میں سیرت النبیؐ، الفاروقؓ، سیرت عائشہؓ، رحمت عالمؐ، تاریخ اسلام، اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، سیرت النعمان، موازنہ انیس و دبیر اور کئی دوسری کتابیں شامل ہیں۔ منافع خوری کی اس اندھی دوڑ میں یہ

ناشرین کسی بھی ضابطہ اخلاق کی پابندی کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔اس سے اس ملی ادارہ کو جو نقصان پہنچ چکا ہے اور برابر پہنچ رہا ہے اس کا آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔بازار میں ان کتابوں کی غیر معمولی مانگ اور تسلسل سے شائع ہونے والے ان کے مسروقہ ایڈیشنوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ اگر یہ تمام کتابیں صرف دارالمصنفین سے شائع ہوتیں تو اسے وسائل کی ایسی کمی کا سامنا نہ کرنا پڑتا اور اس کے اپنے وسائل بڑی حد تک اس کی ضروریات کی تکمیل کے لیے کافی ہوتے۔ماضی میں اس کی مطبوعات کی فروخت سے حاصل ہونے والی آمدنی ہی سے اس کی بنیادی ضروریات پوری کی جاتی رہی ہیں۔ منفعت اندوزی کی اس بے لگام ہوس سے اس عظیم ملی ورثہ کو جو جراحت پہنچی ہے اس کو دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔ان ناشرین سے ہماری دردمندانہ اپیل ہے کہ وہ اپنی تجوریوں کا پیٹ بھرنے کے لیے اس عظیم ملی ادارہ کو مزید نقصان نہ پہنچائیں۔دارالمصنفین کے بہی خواہوں اور قدردانوں سے بھی اس سلسلہ میں ہر ممکن تعاون کی درخواست ہے۔

نعت کا ایک مشہور شعر ہے۔

ہزار بار بشویم دہن زمشک و گلاب ہنوز نامِ تو بردن کمالِ بی ادبیست

اس کی نہایت خوبصورت تعبیر ۱۳/ اکتوبر کو برمنگھم کے مسلم نوجوانوں نے پیش کی۔اہانت رسول ﷺ کی ناپاک جسارت کے خلاف دنیا کے طول وعرض میں جو مظاہرے کیے گئے ان میں کئی جگہ ان آداب اور حدود کا پورا لحاظ نہیں رکھا جاسکا جن کو رحمۃ للعلمین کے نام پر ہونے والے کسی بھی کام میں ہر قیمت پر ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔جو ذات گرامی عالم امکان کی ساری رعنائی، زیبائی، حسن وخوبی اور اچھائی کا مجموعہ تھی اور جس کے لیے بجا طور پر آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری کہا گیا، اس ذات والا صفات کی نسبت سے ہونے والے مظاہروں اور احتجاجوں میں ان چیزوں کا کوئی جواز نہیں ہوسکتا جو آپؐ کی تعلیمات کے منافی ہوں۔ برمنگھم کے مسلم نوجوانوں نے اپنے کرب اور غم وغصہ کے اظہار کا ایک نہایت خوبصورت اور دل کو چھو لینے والا طریقہ اختیار کیا۔اس احتجاج میں لوگوں کو گلاب کے پھول پیش کیے گئے۔ان کے ساتھ ایک کارڈ منسلک تھا جس میں اختصار سے آپؐ کی حیات طیبہ اور آپؐ کے پیغام کے بعض اہم گوشوں پر روشنی ڈالی گئی تھی۔اس مناسبت سے ایک ویب سائٹ کا بھی افتتاح کیا گیا جس کا مقصد دنیا کو آپؐ کی حیات طیبہ اور پیغام سے روشناس کرانا ہے۔اس مثال سے متاثر ہو کر بعض اور مقامات پر اس قسم کے احتجاجوں کا اہتمام کیا گیا۔واقعہ یہ ہے کہ اس ذات گرامی سے تعلق کے اظہار میں بھی بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

مقالات

قتل عمد میں دیت ومعافی اور امت اسلامیہ کا موقف

جناب مولانا بدر احمد مجیبی

(۲)

تیسری حدیث: ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، سنن کبری بیہقی، مسند احمد وغیرہ میں حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے:

قال ما أتى النبى صلى الله عليه وسلم فى شيئ فيه قصاص إلا أمر فيه بالعفو (۳۷)	حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ حضرت رسول اللہ ﷺ کے پاس جب بھی قصاص کا کوئی مقدمہ آتا تو آپؐ اس میں معاف کرنے کا حکم دیتے۔

حضرت انسؓ کی یہ حدیث بھی صحیح سند سے مروی ہے۔قصاص قتل عمد میں ہی ہوتا ہے، قتل خطا میں دیت لازم ہوتی ہے۔اس حدیث میں قتل عمد میں معافی کی پوری وضاحت موجود ہے کہ قصاص کا جب بھی کوئی معاملہ حضرت ﷺ کے پاس آتا تو معافی کا حکم دیتے۔یعنی آپ ﷺ کی پہلی کوشش یہی ہوتی کہ معافی پر معاملہ ختم ہوجائے۔اگر ولی مقتول راضی نہ ہوتا تو قصاص لیا جاتا۔ جیسا کہ بعض موقع پر قصاص لیے جانے کا تذکرہ ملتا ہے۔

چوتھی حدیث: مصنف ابن ابی شیبہ، دارقطنی، احکام القرآن جصاص رازی وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه	حضرت رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا۔عمد میں

پھلواری شریف، پٹنہ۔

وسلم : العمد قود إلا أن يعفو ولی المقتول ۔(۳۸)	قصاص ہے سوا اس کے کہ مقتول کا ولی معاف کردے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی اس حدیث سے قتل عمد میں معافی کا حکم پوری صراحت کے ساتھ ثابت ہوجاتا ہے۔

پانچویں حدیث: صحاح ستہ اور دوسری کتب حدیث میں حضرت ابوہریرہؓ سے فتح مکہ کے موقع پر خطبہ نبوی کی ایک طویل حدیث مروی ہے۔اس میں ہے۔

ومن قتل لہ قتیل فھو بخیر النظرین إما أن یفدی و إما أن یقید (۳۹)	جس شخص کا کوئی (ولی) قتل کردیا جائے تو اس کو دو میں سے ایک چیز کا اختیار ہوگا یا تو فدیہ (دیت) لے یا قصاص لے۔

یہ حدیث صحیح ہے اس میں صراحت کے ساتھ قتل عمد میں قصاص کے ساتھ فدیہ یعنی دیت کا ذکر بھی موجود ہے کہ ولی مقتول کو ان دونوں میں سے ایک کو لینے کا اختیار ہوگا۔

چھٹی حدیث: ابن ماجہ، ابوداؤد، دارمی، مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ، طحاوی، بیہقی، مسند احمد بن حنبل اور دوسری کتب حدیث میں حضرت ابوشریح خزاعیؓ سے مروی ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : من أصیب بدم أو خبل والخبل الجراح فھو بالخیار بین إحدی ثلاث، فإن أراد الرابعة فخذوا علی یدیہ ، أن یقتل أو یعفو أو یأخذ الدیة ، فمن فعل من ذلک شیئاً فعاد فإن لہ نار جھنم خالداً مخلداً فیھا أبداً ۔(۴۰)	حضرت رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا۔ جو شخص قتل یا جراحت کے معاملہ میں مبتلا ہو (یعنی ولی مقتول یا خود مجروح شخص) اس کو تین چیزوں میں سے ایک کا اختیار ہوگا۔اگر وہ (ان تین کے علاوہ) چوتھا کام کرنا چاہے تو اس کے دونوں ہاتھ پکڑلو۔(تین چیزیں یہ ہیں) کہ وہ (قصاص میں) قتل کرے یا معاف کردے یا دیت لے لے۔جس نے ان میں سے کوئی کام کیا پھر لوٹ گیا (یعنی دیت لینے یا معاف کرنے کے بعد پھر قتل کردیا) تو اس کے لیے

جہنم کی آگ ہے جس میں وہ برابر رہے گا۔

اس حدیث میں قتل عمد میں تینوں اختیارات صراحت کے ساتھ ولی مقتول کو تفویض کیے گئے ہیں کہ اس کو ان تینوں میں مکمل اختیار ہوگا ، وہ چاہے تو قصاص میں قاتل کو قتل کردے یا مالی معاوضہ، دیت لے یا مکمل معاف کردے۔ البتہ ان میں سے ایک ہی چیز کا اختیار ہوگا۔ دیت لینے یا معاف کرنے کے بعد اب اس کو قتل کرنے کا اختیار نہیں ہوگا ، ورنہ اس کے لیے دوزخ کا شدید عذاب ہے۔

صحابہ کرامؓ: احادیث نبویہ سے قتل عمد میں دیت ومعافی کے ثبوت مل جانے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ بھی اسی کے قائل تھے۔ متعدد اکابر صحابہ کرامؓ سے اس کی صراحت بھی ملتی ہے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ قتل عمد میں قصاص کے علاوہ دیت و معافی کے بھی قائل تھے۔

عن عمر بن الخطاب قال: ولا یمنع سلطان ولی الدم أن یعفو إن شاء أو یاخذ العقل إذا اصطلحوا ولا یمنعه أن یقتل إن أبی إلا القتل بعد أن یحق له القتل فی العمد ۔(۴۱)	حضرت عمر بن خطابؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا۔ ولی مقتول کو قتل عمد میں قتل کا حق حاصل ہوجانے کے بعد بادشاہ (یا حکومت کا ذمہ دار) اس کو معاف کرنے سے نہیں روکے گا اگر وہ معاف کرنا چاہے یا اگر دیت پر مصالحت ہوجائے تو اس کو دیت لینے سے بھی نہیں روکے گا اور اس کو قتل کرنے سے بھی نہیں روکے گا اگر وہ قتل کے علاوہ کسی چیز پر راضی نہیں ہے۔ (یعنی قتل عمد میں قصاص، دیت یا معافی کا اصل اختیار ولی مقتول کو حاصل ہوتا ہے۔ حکومت یا عدلیہ کی طرف سے اس میں مداخلت درست نہیں ہے)
عن قتادۃ أن عمر بن الخطاب	حضرت عمر بن خطابؓ کے پاس ایک شخص کو

رفع إليه رجل قتل رجلا فجاء أولياء المقتول وقد عفا أحدهم فقال عمر لابن مسعود وهو إلى جنبه ماتقول؟ فقال ابن مسعود: أقول: إنه قد أحرز من القتل، قال: فضرب على كتفه ثم قال: كنيف ملئ علماً ۔(۴۲)	لایا گیا جس نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا، مقتول کے اولیاء بھی آئے ۔ اولیائے مقتول میں سے ایک نے قاتل کو معاف کر دیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے قریب بیٹھے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے کہا کہ اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا کہ وہ قتل سے بچ گیا۔ حضرت عمرؓ نے (ان کی تائید کرتے ہوئے) ان کے کندھے پر ہاتھ مارا اور فرمایا کہ تھیلا علم سے بھرا ہوا ہے۔
قد أجاز عمر وابن مسعود رضي اللّٰه عنهما العفو من أحد الأولياء ۔(۴۳)	حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اولیاء میں سے کسی ایک کی جانب سے معافی کو درست قرار دیا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی قتل عمد میں معافی کے قائل تھے۔ آپ کے واقعۂ شہادت کے بارے میں صراحت ملتی ہے کہ زخمی ہونے کے بعد آپ نے فرمایا تھا کہ میں اپنے خون کا ولی ہوں۔ اگر زندہ رہا تو خود فیصلہ کروں گا کہ قصاص لوں یا معاف کر دوں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ معافی کو بھی درست سمجھتے تھے۔

عن جعفر بن محمد عن أبيه أن علي ابن أبي طالب رضي الله عنه كان يخرج إلى الصبح وفي يده درته يوقظ بها الناس فضربه ابن ملجم فقال علي رضي الله عنه أطعموه واسقوه وأحسنوا أساره فإن عشت فأنا ولي دمي	حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ صبح (کی نماز) کے لئے نکلتے تھے اور ان کے ہاتھ میں ان کا درہ ہوتا تھا۔ جس سے لوگوں کو جگاتے تھے۔ (اسی موقع پر) ابن ملجم نے آپ کو مارا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اس کو کھلاؤ، پلاؤ اور قید میں اس کا خیال رکھو۔ اگر میں زندہ رہا تو میں اپنے خون کا ولی ہوں، اگر

أعفو إن شئت وإن شئت استقدت ۔(۴۴)	میں چاہوں تو معاف کردوں اور اگر چاہوں تو قصاص لوں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بھی قتل عمد میں معافی کو درست سمجھتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک اگر کوئی مجروح یا ولی مقتول جارح یا قاتل کو معاف کردیتا ہے تو یہ معاف کرنا معاف کرنے والے (یعنی مجروح یا ولی مقتول) کے گناہوں کی مغفرت کا سبب ہوگا اور گناہوں کی یہ بخشش اسی قدر ہوگی جتنا اس نے معاف کیا ہے۔

عن الهيثم أبي العريان النخعي قال رأيت عبد الله بن عمرو عند معاوية أحمر شبيهاً بالموالي فسألته عن قول الله عزوجل (فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ) قال: يهدم عنه من ذنوبه بقدر ما تصدق به ۔(۴۵)	ہیثم ابوالعریان نخعی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کو حضرت معاویہؓ کے پاس دیکھا، وہ موالی (اہل عجم) کے مشابہ سرخ وسفید تھے۔ میں نے ان سے اللہ تعالی کے اس قول کا مطلب پوچھا۔ جو صدقہ کر دے (یعنی قصاص کو معاف کردے) اس کے لیے کفارہ ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ جتنا اس نے صدقہ (معاف) کیا ہے اسی کے مقدار اس کے گناہوں میں سے ختم کر دیا جائے گا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عروہ بن مسعود ثقفیؓ بھی قتل عمد میں قصاص کے علاوہ معافی یا دیت کو بھی درست سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان سے مروی ہے کہ اگر وفات سے پہلے مقتول قاتل کو معاف کردے تو یہ معاف کرنا درست ہوگا اور قاتل کو قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔

عن أنس بن مالک رضي الله عنه أن رجلا أتى النبي صلى الله عليه وسلم بقاتل وليه فقال النبي صلى الله عليه وسلم: اعف عنه، فأبى، فقال: خذ الدية، فأبى	حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص حضرت رسول اللہؐ کے پاس اپنے ولی کے قاتل کو لے کر آیا، حضرتؐ نے فرمایا کہ اس کو معاف کر دو۔ وہ اس پر تیار نہیں ہوا تو حضرتؐ نے فرمایا کہ دیت لے لو، وہ اس پر

فقال: اذهب فاقتله فإنک مثله، فخلى سبيله، فرؤى الرجل وهو يجر نسعته ذاهباً إلى أهله، وفيه عن ابن مسعود وابن عباس والحسن وطاؤس وعروة بن مسعود الثقفى فى عفو المقتول جائز ۔(۴۶)

بھی تیار نہیں ہوا تو آپ نے فرمایا کہ جاؤ اس کو قتل کردو تم بھی اسی کے مثل ہو جاؤ گے ۔ تو اس نے اس کا راستہ چھوڑ دیا (یعنی بلا معاوضہ اس کو معاف کر دیا) اور اس (قاتل کو) دیکھا گیا کہ وہ اپنی ڈوری کھینچتا ہوا اپنے گھر والوں کی طرف جا رہا تھا۔ اس سلسلے میں عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ، حسن بصریؒ، طاؤسؒ، عروہ بن مسعود ثقفیؓ سے مروی ہے کہ (مرنے سے قبل) مقتول کا خود معاف کرنا درست ہے۔

سلطاناً أى تسليطاً إن شاء قتل و إن شاء عفاوإن شاء أخذ الدية، قاله ابن عباس رضى الله عنهما والضحاک وأشهب والشافعى ۔(۴۷)

سلطان سے مراد مکمل اختیار ہے، اگر چاہے تو قتل کرے، چاہے تو معاف کرے اور اگر چاہے تو وہ دیت لے۔ یہ ابن عباسؓ، ضحاک، اشہب اور امام شافعی کہتے ہیں۔

اجلہ صحابہ حضرت عمر فاروق، حضرت علی مرتضی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہم اجمعین سے اس کی صراحت ملی کہ قتل عمد میں صرف قصاص ہی واجب نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بھی بعض چیزوں کی اجازت ہے۔ چنانچہ اس میں دیت لینا بھی جائز ہے اور ولی مقتول کی طرف سے معاف کر دینا بھی درست ہے۔

حضرات تابعینؒ: صحابہ کرامؓ کے بعد حضرات تابعین کے نزدیک بھی قتل عمد میں صرف قصاص متعین نہیں ہے بلکہ مجروح اور ولی مقتول کو دیت اور معافی کا اختیار بھی ہے۔ چنانچہ امام حسن بصریؒ (۴۸) بھی قتل عمد کے معاملہ میں معاف کرنے کو درست سمجھتے تھے۔

عن يونس عن الحسن قال: إذا

امام حسن بصریؒ نے فرمایا۔ جب کوئی آدمی

عفا الرجل عن قاتله قبل أن یموت فهو جائز ۔(۴۹)	اپنی موت سے قبل اپنے قاتل کو معاف کر دیتا ہے تو یہ درست ہے۔

امام طاؤسؒ (۵۰) بھی قتل خطا اور قتل عمد دونوں میں معاف کرنے کو درست سمجھتے تھے۔

عن ا بن طاؤس قا ل قلت لأبی: الرجل یقتل فیعفو عن دمه؟ قال: جائز. قلت :خطأ وعمدا؟ قال نعم ۔(۵۱)	ابن طاؤس کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد (حضرت طاؤسؒ) سے سوال کیا کہ کسی کو قتل کر دیا جاتا ہے اور وہ (مرنے سے قبل) اپنے خون کو معاف کر دیتا ہے؟ طاؤسؒ نے کہا کہ یہ درست ہے۔ میں نے سوال کیا کہ قتل خطا ہو یا قتل عمد؟ امام طاؤسؒ نے جواب دیا کہ ہاں۔ (یعنی دونوں صورتوں میں معافی ہوسکتی ہے)

امام زہریؒ (۵۲) کے نزدیک بھی قتل عمد میں قصاص کے علاوہ معافی یا دیت کا اختیار مقتول کے اولیاء کو ہوتا ہے۔

عبد الرزاق عن معمر عن الزهری قال وکتب به عمر بن عبد العزیز ایضاً قال : اذا عفا أحدهم فالدیة ۔(۵۳)	امام زہری سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کو تحریر بھی کیا۔ کہ جب اولیاء میں سے کوئی ایک شخص (قاتل کو) معاف کر دے تو اب (قصاص ختم ہو جائے گا) دیت باقی رہے گی۔

مجاہدؒ (۵۴)، ابو العالیہؒ (۵۵)، ابو الشعثاءؒ (۵۶) اور سعید بن جبیرؒ (۵۷)، یہ حضرات تابعین بھی قتل عمد میں صرف قصاص کو متعین نہیں سمجھتے تھے، بلکہ دیت لینے کو بھی درست سمجھتے تھے۔

وقال مجاهدعن ابن عباس (فمن عفی له من أخیه شیئ) فالعفو أن یقبل الدیة فی العمد وکذا روی	مجاہد نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ اس آیت میں معافی کا مطلب یہ ہے کہ قتل عمد میں دیت قبول کرلے۔ اسی طرح

عن ابی العالية و ابی الشعثاء و مجاهد و سعيد بن جبير ـ(۵۸)

ابوالعالیہ، ابوالشعثاء، مجاہد، سعید بن جبیر سے مروی ہے۔

امام ابراہیم نخعیؒ (۵۹) بھی ان تین چیزوں کے قائل تھے۔ اگر مقتول کے اولیاء قتل کرنے کے بجائے دیت لینا چاہیں اور قاتل دیت دینے پر آمادہ نہ ہو تو امام نخعیؒ کا فتوی یہ ہے کہ قاتل کی رضامندی کے بغیر جبراً اس پر دیت لازم نہیں کی جاسکتی۔ اولیائے مقتول اس سے دیت نہیں لے سکتے، ان کو قتل یا معافی کا اختیار ہوگا۔ البتہ اگر قاتل دیت دینے پر رضامند ہوجائے تو دیت لے سکتے ہیں۔

عن منصور عن ابراهيم فی رجل يقتل عمدا فيقول أولياؤه: نحن نريد الدية و يقول القاتل: اقتلونی قال: ليس لهم إلا الدم، إن شاء وا قتلوه وإن شاء وا عفوا إلا أن يشاء القاتل أن يعطی الدية۔(٦٠)

ایسے شخص کے بارے میں جس نے عمداً قتل کیا اور مقتول کے اولیاء اس سے دیت چاہتے ہیں لیکن قاتل کہتا ہے کہ مجھے قتل کردو (یعنی وہ دیت دینے پر رضامند نہیں ہے) امام ابراہیم نخعیؒ نے فرمایا کہ (اولیاء مقتول کو دیت لینے کا اختیار نہیں ہوگا) ان کو قتل کرنے کا اختیار ہوگا اگر وہ چاہیں تو قتل کریں اور اگر چاہیں تو معاف کردیں۔ مگر یہ کہ قاتل دیت دینے پر رضامند ہوجائے (تو دیت لے سکتے ہیں)

عن حماد عن ابراهيم قال : من عفا من ذی سهم فعفوه عفو ـ (٦١)

امام ابراہیم نخعیؒ نے فرمایا کہ مقتول کے وارثین میں سے کسی نے معاف کردیا تو اس کا معاف کرنا معافی سمجھی جائے گی۔ (یعنی اب قاتل سے قصاص نہیں لیا جاسکتا ہے۔ بقیہ وارثوں کا حق مالی معاوضہ میں ہوگا)

حضرت زید بن اسلمؒ (۶۲) بھی قتل عمد میں قصاص یا دیت یا معافی میں ولی مقتول کے اختیار کے قائل تھے۔

سفيان عن زيد بن اسلم قال سمعته يقول : إن عفا عنه أو اقتص منه أو قبل منه الدية فهو كفارة له ـ(۶۳)

سفیان کہتے ہیں کہ میں نے زید بن اسلم کو کہتے ہوئے سنا کہ اگر (ولی مقتول) قاتل کو معاف کردے یا اس سے قصاص لے لے یا دیت قبول کرلے تو وہ اس (قاتل) کے لیے کفارہ ہوگا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (۶۴) بھی ان تین چیزوں میں اختیار کے قائل تھے۔

عن معمر قال كتب عمر بن عبد العزيز فى أمرأة قتلت رجلا إن أحب الأولياء أن يعفوا عفوا وإن أحبوا أن يقتلوا قتلواو إن أحبوا أن يأخذوا الدية أخذوها وأعطوا امرأته من الميراث من الدية ـ(۶۵)

معمر کہتے ہیں کہ کسی عورت نے ایک شخص کو قتل کردیا تھا اس کے معاملہ میں عمر بن عبدالعزیزؒ نے تحریر کیا کہ اگر مقتول کے اولیاء معاف کرنا چاہیں تو معاف کردیں، اگر (قصاص میں عورت کو) قتل کرنا چاہیں تو قتل کردیں اور اگر دیت لینا چاہیں تو دیت لے لیں اور مقتول کی بیوہ کو دیت میں سے میراث کے مطابق دیں۔

كتب عمر بن عبد العزيز رحمه الله إلى أمراء الأجناد لايمنع سلطان ولى الدم أن يعفو إن شاء و ياخذ العقل إن شاء إذا اصطلحوا عليه ولايمنعه أن يقتل إن أبى إلا أن يقتل فى العمد ـ(۶۶)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے لشکروں کے امراء کو تحریر کیا کہ ولی مقتول کو قتل عمد میں قتل کا حق حاصل ہوجانے کے بعد بادشاہ (یا حکومت کا کوئی ذمہ دار) اس کو معاف کرنے سے نہیں روکے اگر وہ معاف کرنا چاہے یا اگر دیت پر مصالحت ہوجائے تو اس کو دیت لینے سے بھی نہیں روکے اور اس کو قتل کرنے سے بھی نہیں روکے اگر وہ قتل کے علاوہ کسی چیز پر راضی نہیں ہے۔ (یہ ویسا ہی حکم ہے جیسا حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا تھا جس کا مصنف عبدالرزاق کے

حوالہ سے اوپر ذکر آ چکا ہے)

حضرت قتادہؒ (۶۷) بھی ان تین چیزوں میں اختیار کے قائل تھے۔

عبدالرزاق عن معمر عن قتادة قال : إذا عفا أحد الأولياء فإنها تكون دية وتسقط عن القاتل بقدر حصة هذا الذى عفا ـ(٦٨)	قتادہؒ کہتے ہیں۔جب مقتول کے اولیاء میں سے کوئی ایک قاتل کو معاف کر دیتا ہے تو (اب قصاص ختم ہوجاتا ہے۔البتہ) دیت رہ جاتی ہے اور دیت میں سے معاف کرنے والے کے حصے کے بقدر قاتل سے ساقط ہو جاتا ہے۔

حضرت عطاء بن ابی رباحؒ (۶۹) بھی ولی مقتول کے لیے قصاص، دیت یا معافی میں اختیار کے قائل تھے۔

عبد الرزاق عن ابن جريج قال قلت لعطاء: رجل قتل رجلين عمداً فعفا أهل أحدهما ولم يعف الآخرون قال:لم يقتل ولكنه يعطى الذين لم يعفو شطر الدية ـ(٧٠)	ابن جریج کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عطاءؒ سے کہا کہ ایک شخص نے دو آدمیوں کو جان بوجھ کر قتل کر دیا، پھر ان میں سے ایک کے اولیاء نے اس کو معاف کر دیا، دوسروں نے معاف نہیں کیا۔امام عطاءؒ نے فرمایا۔اس کو قتل نہیں کیا جائے گا، جن لوگوں (یعنی دوسرے مقتول کے اولیاء) نے معاف نہیں کیا ہے ان کو نصف دیت دی جائے گی۔

تھوڑی جستجو سے ان بارہ حضرات تابعین حسن بصری، طاؤس، مجاہد، زہری، سعید بن جبیر، ابوالعالیہ، ابوالشعثاء، عمر بن عبدالعزیز، ابراھیم نخعی، زید بن اسلم، قتادہ، عطاء بن ابی رباح رحمہم اللہ کے بارے میں صراحت مل گئی کہ یہ حضرات قتل عمد میں دیت یا معافی کو درست سمجھتے تھے۔ تفسیر و حدیث کی کتابوں میں تلاش کرنے پر اس سلسلے میں مزید کچھ دیگر تابعین کی بھی صراحت مل سکتی ہے۔

صحابہ اور تابعین کے بعد ہم دیکھیں کہ مجتہدین امت کا اس میں کیا مسلک ہے۔ کیا ان کے نزدیک قتل عمد میں صرف قصاص ہی ہے یا ولی مقتول چاہے تو دیت بھی لے سکتا ہے اور مکمل معاف بھی کر سکتا ہے؟ بدایۃ المجتہد میں علامہ ابن رشد سب ائمہ کا اتفاق اس پر نقل کرتے ہیں کہ مقتول کے ولی کو ان تین چیزوں کا اختیار ہوگا۔

فاتفقوا على أن لولي الدم أحد شيئين : القصاص أو العفو إما على الدية و إما على غير الدية ۔(۷۱)	سب کا اس پر اتفاق ہے کہ مقتول کے ولی کو دو چیزوں میں سے ایک کا اختیار ہوگا۔ قصاص یا معافی۔ معافی بھی یا تو دیت پر ہوگی یا بغیر دیت کے۔ (گویا تین چیزوں کا اختیار ہوا۔ قصاص یا دیت پر معافی یا دیت کے بغیر مکمل معافی)

یہ مجموعی اعتبار سے فقہاء اور مجتہدین کا مسلک معلوم ہوا۔ ہم قتل عمد کے سلسلے میں ائمہ اربعہ کا مسلک ان کی فقہ کی کتابوں سے نقل کرتے ہیں تاکہ ہر ایک کا مسلک واضح طور سے معلوم ہو جائے اور کسی کو اس میں شبہ یا انکار کی گنجائش باقی نہ رہے۔

فقہ حنفی: امام طحاوی فرماتے ہیں۔

فبين لهم رسول الله صلى الله عليه وسلم ذلك أيضاً على هذه الجهة فقال: من قتل له ولي فهو بالخيار بين أن يقتص أو يعفو أو يأخذ الدية ۔(۷۲)	حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اس جہت سے بھی وضاحت فرما دی، ارشاد فرمایا کہ جس کا کوئی ولی قتل ہو جائے اس کو اختیار ہوتا ہے کہ قصاص لے یا معاف کرے یا دیت لے لے۔

فقہ حنفی کے متن "المختار" للموصلی میں ہے۔

وحكمه المأثم والقود إلا أن يعفو الأولياء أو وجوب المال عند المصالحة برضى القاتل في	قتل عمد کا حکم (یعنی نتیجہ) گناہ اور قصاص ہے، مگر یہ کہ (مقتول کے) اولیاء معاف کر دیں یا قاتل مال دینے پر رضامند ہو تو

ماله ۔(۷۳)

مصالحت کے وقت مال کا وجوب ہوگا۔

تنویر الابصار اور اس کی شرح الدر المختار میں ہے۔

ویسقط القود بموت القاتل لفوات المحل وبعفو الأولیاء و بصلحهم علی مال ولو قلیلا ۔(۷۴)

محل فوت ہوجانے کی وجہ سے قاتل کی موت سے قصاص ساقط ہوجاتا ہے اور اولیاء کے معاف کرنے سے بھی اور مال پر مصالحت کر لینے سے بھی اگرچہ مال قلیل ہی کیوں نہ ہو۔

فقہ مالکی: امام مالک کی مشہور وممتاز کتاب مؤطا میں "**باب العفو عن قتل العمد**" کے نام سے ایک باب قائم ہے۔جس میں قتل عمد میں دیت ومعافی کا مسئلہ اس طرح موجود ہے۔

حدثنی یحیی عن مالک أنه أدرک من یرضی من أهل العلم یقولون فی الرجل إذا أوصی أن یعفی عن قاتله إذا قتل عمداً إن ذلک جائز له، و أنه أولی بدمه من غیره من أولیاء ہ من بعده ۔

یحیٰی امام مالک سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے اہل علم میں سے پسندیدہ لوگوں کو پایا ہے جو یہ کہتے تھے کہ جب کسی شخص کو عمداً قتل کردیا جائے اور وہ (مرنے سے پہلے) وصیت کرے کہ اس کے قاتل کو معاف کردیا جائے تو یہ اس کے لیے جائز ودرست ہے۔اپنے بعد اپنے اولیاء کی بہ نسبت وہ اپنے خون کا زیادہ حقدار ہے۔

قال مالک فی رجل یعفو عن قتل العمد بعد أن یستحقه ویجب له : أنه لیس علی القاتل عقل یلزمه إلا أن یکون الذی عفا عنه اشترط ذلک عند العفو عنه ۔(۷۵)

ایسا شخص (یعنی ولی مقتول) جو قصاص لینے کا حقدار ہوجائے اور یہ اس لئے واجب ہوجائے اس کے بعد وہ قتل عمد کو (دیت کی شرط لگائے بغیر) معاف کردے اس کے بارے میں امام مالک فرماتے ہیں کہ اس قاتل پر دیت لازم نہیں ہے ۔(یعنی اس کو مکمل معافی ہوجائے گی) مگر یہ کہ معاف کرنے والے نے معافی

کے وقت ہی دیت لینے کی شرط لگادی ہو۔

امام ابن عبدالبر قرطبی مالکی لکھتے ہیں۔

ومن عفا عن جرح جرحه ثم مات وقال إن مت من هذا الجرح فقد عفوت صح عفوه ولم يتبع الجاني بشيئ . هذا هو المشهور عن مالك ۔(۷۶)	جس شخص نے کسی ایسی جراحت کو جو اس کو لگائی گئی تھی معاف کردیا اور کہا اگر میں اس جراحت کی وجہ سے وفات پا جاؤں تو میں نے اس کو معاف کردیا تو اس کا معاف کرنا درست ہوگا اور قاتل سے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔امام مالک کا یہی مشہور مسلک ہے۔

فقہ شافعی: امام شافعی کی مشہور و معروف کتاب ''کتاب الام'' میں قتل عمد میں دیت یا معافی کے جواز سے متعلق ان کا واضح قول موجود ہے۔

قال الشافعي : فأيما رجل قتل قتيلا فولي المقتول بالخيار إن شاء قتل القاتل و إن شاء أخذ منه الدية و إن شاء عفا عنه بلادية ۔ (۷۷)	امام شافعی فرماتے ہیں کہ جس شخص نے کسی کو قتل کردیا تو مقتول کے ولی کو اختیار ہوگا،اگر چاہے تو قاتل کو قتل کردے،چاہے تو دیت لے لے اور چاہے تو دیت کے بغیر معاف کردے۔

فقہ شافعی کی اہم کتاب ''المجموع'' میں امام نووی لکھتے ہیں۔

فإذا كان القصاص لجماعة فعفا بعضهم عن القود سقط القود عن القاتل ... وروى أن رجلاً قتل رجلاً وأراد ورثة المقتول أن يقتصوا فقالت زوجة القاتل وكانت أخت المقتول: قد عفوت عن نصيبي من القود فقال	جب قصاص کا حق ایک جماعت کو حاصل ہو اور ان میں سے بعض قصاص کو معاف کردیں تو قاتل سے قصاص ساقط ہوجاتا ہے۔روایت ہے کہ ایک شخص نے کسی کو قتل کردیا اور مقتول کے ورثہ نے قصاص لینا چاہا۔قاتل کی بیوی جو مقتول کی بہن تھی اس نے کہا کہ میں نے قصاص میں سے اپنا حصہ معاف کردیا۔اس

عمر رضی الله عنه: نجا من القتل وكذلك روى عن ابن مسعود ولا مخالف لهما فى الصحابة فدل ذلك على أنه إجماع (۷۸)

پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یہ قتل سے نجات پا گیا۔اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی مروی ہے۔صحابہ میں ان دونوں کا کوئی مخالف بھی نہیں ہے۔اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس پر سب کا اتفاق ہے۔

فقہ حنبلی: فقہ حنبلی کی مشہور کتاب ''الانصاف'' میں ایک پورا باب ہی ''باب العفو عن القصاص'' کے عنوان سے ہے۔اس کی عبارت درج کی جاتی ہے۔

قوله : والواجب بقتل العمد أحد شيئين القصاص أو الدية فى ظاهر المذهب هذا المذهب المشهور المعمول به فى المذهب وعليه الأصحاب فعلى المذهب الخيرة فيه إلى الولى فإن شاء اقتص وإن شاء أخذ الدية وإن شاء عفا إلى غير شيئ. والعفو أفضل بلانزاع فى الجملة ۔(۷۹)

ظاہر مسلک میں قتل عمد سے دو چیزوں میں سے ایک چیز واجب ہوتی ہے، قصاص یا دیت۔یہی مسلک مشہور اور معمول بہ ہے۔اسی پر اصحاب ہیں۔مسلک کے مطابق اس میں اختیار ولی کو ہوگا، اگر چاہے تو قصاص لے، اگر چاہے تو دیت لے اور اگر چاہے تو کوئی چیز لیے بغیر معاف کر دے اور معاف کرنا بلا اختلاف فی الجملہ افضل ہے۔

دوسرے مسالک: امام محمد بن جریر طبری جو خود مجتہد اور ایک مسلک کے بانی تھے لکھتے ہیں۔

فإن قال قائل أفرض على ولى القتيل القصاص من قاتل وليه؟ قيل: لا، ولكنه مباح، له ذلك والعفو وأخذالدية۔(۸۰)

اگر کوئی کہے کہ کیا مقتول کے ولی پر اس کے ولی کے قاتل سے قصاص فرض ہے؟ تو کہا جائے گا کہ نہیں،لیکن مباح ہے،ولی مقتول کے لیے معاف کرنا اور دیت لینا بھی جائز ہے۔

علامہ شوکانی نیل الاوطار میں '' باب فضل العفو عن الاقتصاص والشفاعة فى ذلك'' میں لکھتے ہیں۔

والترغيب في العفو ثابت بالاحاديث الصحيحة ونصوص القرآن الكريم ولاخلاف في مشروعية العفو في الجملة وإنما وقع الخلاف فيما هو الأولى للمظلوم هل العفو عن ظالمه أو الترك ـ(۸۱)	معاف کرنے کی ترغیب احادیث صحیحہ اور نصوص قرآنیہ سے ثابت ہے اور فی الجملہ معافی کی مشروعیت میں کوئی اختلاف نہیں ہے ۔ اختلاف اس میں ہے کہ مظلوم کے لیے بہتر کیا ہے ، ظالم کو معاف کر دینا یا معاف نہ کرنا ۔ (یعنی قصاص لینا یا دیت لینا)

ان تمام تفصیلات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ عہد نبوی سے لے کر بعد کے زمانے تک صحابہ، تابعین، ائمہ مجتہدین، مفسرین، محدثین وفقہاء سب کے نزدیک یہ بات طے شدہ ہے کہ قتل عمد میں اصل سزا تو قصاص ہے مگر ولی مقتول چاہے تو قصاص کے بجائے دیت بھی لے سکتا ہے اور مکمل معاف بھی کرسکتا ہے۔اس طویل عرصہ میں امت اسلامیہ کے علماء ،فقہاء ،محدثین، مفسرین کی بڑی جماعت گزری ہے۔لیکن ان میں سے کسی ایک فرد سے بھی اس کی صراحت نہیں ملتی کہ قتل عمد میں صرف قصاص ہے اور ولی مقتول کو دیت یا معافی کا اختیار نہیں ہے۔تمام حضرات اسی کے قائل نظر آتے ہیں کہ ولی مقتول کو یہ تینوں اختیارات حاصل ہوں گے۔

حواشی

(۳۷) السنن لابی داؤد: کتاب الدیات،باب الامام یامربالعفوفی الدم، السنن للنسائی: کتاب القسامة ، باب الامر بالعفو عن القصاص، السنن لابن ماجه: کتاب الدیات ۶۹۶/۳، السنن الکبری للبیهقی: باب ماجاء فی الترغیب عن العفو فی القصاص،۵۴/۸، المسند لاحمد بن حنبل : ۲۱۳/۳، المسند لابی یعلی: ۳۳۶/۶، المسند للبزار :۳۵۴/۲ ـ(۳۸) السنن للدارقطنی : کتاب الحدود و الدیات وغیرها، المصنف لابن ابی شیبة: باب من قال العمد قود ، ۳۶۵/۹ ـأحکام القرآن للجصاص الرازی :۱۶۸/۱ یہ حدیث مسند اسحاق بن راہویہ اور معجم طبرانی میں بھی مروی ہے۔نصب الرایة: ۳۲۷/۴ـ(۳۹)الجامع الصحیح للبخاری :کتاب بدء الوحی، باب کیف تعرف لقطة اهل مکة،

الصحيح للمسلم :باب تحريم مكة وصيدها، السنن لابی داؤد: باب ولی العمد يأخذ الدية، السنن للنسائی : هل يؤخذ من قاتل العمد الدية، الجامع للترمذی :باب ما جاء فی حكم ولی القتيل فی القصاص والعفو، السنن لابن ماجه: كتاب الديات، باب من قتل له قتيل فهو بالخيار بين إحدى ثلاث، الصحيح لابن حبان: باب فضل مكة ۲۸/۹، المسند لاحمدبن حنبل : ۲۳۸/۲، شرح معانی الآثار للطحاوی: باب ماجاء فی قتل العمد وجراح العمد ۱۷۴/۳۔(۴۰) السنن لابن ماجه : كتاب الديات، باب من قتل له قتيل فهو بالخيار بين إحدى ثلاث ۶۴۴/۳۔اس کے علاوہ السنن لابی داؤد: ۱۸۹/۴، السنن للدارمی: ۲۴۷/۲، السنن الكبری للبيهقی : ۵۲/۸، المسند لاحمد بن حنبل: ۳۱/۴، المصنف لابن ابی شيبة: ۴۴۰/۹، شرح معانی الآثار للطحاوی: ۱۷۴/۳، المصنف لعبد الرزاق : ۸۵/۱۰، التاريخ الكبير للبخاری:۲۲۴/۳، السنن للدارقطنی : ۸۶/۴، المنتقی لابن الجارود : ۹۵/۱، المعجم الكبير للطبرانی: ۶۲/۱۶، تهذيب الآثار للطبری :۳۰/۱، كتاب الديات لابن ابی عاصم الشيبانی: ص۹۹وغیرہ میں بھی یہ حدیث مختلف سندوں سے مروی ہے۔ اس حدیث کے ایک راوی سفیان بن ابی العوجاء مختلف فیہ راوی ہیں۔امام بخاری کہتے ہیں کہ ان کی حدیث میں نظر ہے۔ امام ابواحمد حاکم کہتے ہیں کہ ان کی حدیث قائم نہیں ہے۔امام ابوحاتم کہتے ہیں کہ یہ مشہور نہیں ہیں۔امام ابن حبان نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے۔اسی طرح امام عجلی نے بھی ان کا تذکرہ ثقات میں کیا ہے۔اس حدیث کی سند میں کچھ ضعف ضرور ہے لیکن دوسری صحیح سندوں سے ثابت احادیث سے جب اس کی تائید ہو رہی ہے تو یہ حدیث بھی قابل استدلال ہوگی۔متعدد محدثین وفقہاء نے اس سے استدلال کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کو قابل احتجاج سمجھتے ہیں۔ (۴۱)المصنف لعبد الرزاق: ۱۴/۱۰۔(۴۲)المصنف لعبد الرزاق: ۱۳/۱۰۔(۴۳) السنن الكبری للبيهقی : ۵۶/۸۔(۴۴)السنن الكبری للبيهقی: ۵۶/۸۔(۴۵) تفسير القرآن الكريم لابن كثير : ۱۲۴/۳، السنن الكبری للبيهقی: ۵۴/۸، جامع البيان للطبری: ۳۶۵/۱۰۔(۴۶)الديات لابن ابی عاصم الشيبانی: ص ۱۰۳۔ (۴۷)الجامع لأحكام القرآن للقرطبی :۲۵۵/۱۰۔(۴۸)امام حسن بصریؒ کی شخصیت تابعین میں ممتاز ومعروف ہے۔مغیرہ بن شعبہ، عمران بن حصین، جابر بن عبداللہ، عبداللہ بن عباس، انس بن مالک وغیرہ رضی اللہ عنہم صحابہ کرام کے شاگرد ہیں۔ایوب سختیانی، مالک بن دینار، ثابت بنانی وغیرہ تابعین کے استاذ ہیں۔امام ذہبی ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ كان سيد اهل زمانه علما وعملا ۔۱۱۰ھ میں وفات پائی۔(سیر

اعلام النبلاء)۔(۴۹) **کتاب الدیات لابن أبی عاصم الشیبانی: ص ۱۰۵**۔(۵۰)امام طاؤس بن کیسان رحمہ اللہ ممتاز تابعی ہیں۔حضرت عائشہ،زید بن ثابت،عبداللہ بن عباس،ابو ہریرہ،زید بن ارقم رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں۔ عطاء بن ابی رباح،مجاہد،عبداللہ بن طاؤس،امام زہری وغیرہ کے استاذ ہیں۔امام ذہبی ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ **الفقیہ القدوۃ عالم الیمن**۔۱۰۶ھ میں وفات پائی۔(سیر اعلام النبلاء)(۵۱) **کتاب الدیات لابن أبی عاصم الشیبانی : ص ۱۰۴**۔(۵۲)امام محمد بن مسلم بن شہاب الزہری تابعیؒ ہیں۔عبداللہ بن عمر،جابر بن عبداللہ،سہل بن سعد،انس بن مالک وغیرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں۔عطاء،عمر بن عبدالعزیز،قتادہ،زید بن اسلم،امام مالک، امام اوزاعی وغیرہ کے استاذ ہیں۔امام ذہبی ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔**الامام العَلَم حافظ زمانہ**۔۱۲۳ھ میں وفات پائی۔(سیر اعلام النبلاء)۔(۵۳)**مصنف عبد الرزاق ۱۰/۱۳**۔(۵۴)امام مجاہد بن جبر رحمہ اللہ تابعی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے خاص شاگرد ہیں۔ابو ہریرہ،عائشہ،سعد بن ابی وقاص وغیرہ رضی اللہ عنہم کے بھی شاگرد ہیں۔عکرمہ،طاؤس،عطاء وغیرہ کے استاذ ہیں۔امام ذہبی لکھتے ہیں۔ **الامام شیخ القراء والمفسرین**۔۱۰۴ھ میں وفات پائی۔(سیر اعلام النبلاء)۔(۵۵)ابوالعالیہ رفیع بن مہران رحمہ اللہ تابعی ہیں۔حضرت عمر،حضرت علی، حضرت عائشہ،ابوذر غفاری،ابن مسعود،ابوموسی اشعری،ابی بن کعب،زید بن ثابت،ابن عباس وغیرہ رضی اللہ عنہم صحابہ کرام کے شاگرد ہیں۔امام ذہبی لکھتے ہیں۔**الامام المقرئ الحافظ المفسر** ۹۳ھ میں وفات پائی۔(سیر اعلام النبلاء)۔(۵۶)ابوالشعثاء جابر بن زید رحمہ اللہ تابعی ہیں۔حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے خاص شاگرد ہیں۔عمرو بن دینار،ابوایوب سختیانی،قتادہ وغیرہ کے استاذ ہیں۔امام ذہبی لکھتے ہیں۔**کان عالم أهل البصرۃ فی زمانہ یعد مع الحسن وابن سیرین**۔۹۳ھ میں وفات پائی۔(سیر اعلام النبلاء)۔(۵۷)سعید بن جبیر رحمہ اللہ تابعی ہیں۔حضرت عبداللہ بن عباس،حضرت عائشہ،ابو ہریرہ،حضرت ابوموسی اشعری وغیرہ رضی اللہ عنہم صحابہ کرام کے شاگرد ہیں۔ایوب سختیانی، عکرمہ،امام زہری وغیرہ کے استاذ ہیں۔امام ذہبی ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔**الامام الحافظ المقرئ المفسر الشہید**۔۹۵ھ میں شہادت پائی۔(سیر اعلام النبلاء)۔(۵۸) **تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر الدمشقی: ۱/ ۴۹۰**۔(۵۹)امام ابراہیم نخعی تابعی ہیں۔مشہور ومعروف فقیہ ومحدث ہیں،حضرت عائشہ،زید بن ارقم،مغیرہ بن شعبہ، انس بن مالک وغیرہ رضی اللہ عنہم صحابہ کرام کو دیکھا ہے۔مسروق،علقمہ،عبیدہ سلمانی،قاضی شریح وغیرہ کے شاگرد ہیں۔ امام حماد بن ابی سلیمان،امام اعمش،منصور بن معتمر وغیرہ کے استاذ ہیں۔۹۶ھ میں وفات پائی۔(سیر اعلام النبلاء)۔ (۶۰)**المصنف لعبد الرزاق : ۱۰/۸۵**۔(۶۱)**المصنف لعبد الرزاق: ۱۰/۸۵**۔(۶۲)حضرت زید بن اسلمؒ

تابعی ہیں۔حضرت عمرؓ کے مولی اور مشہور راوی حضرت اسلمؒ کے صاحبزادے ہیں،حضرت عبداللہ بن عمرؓ،انس بن مالکؓ، جابر بن عبداللہؓ وغیرہ صحابہ کرام اور سعید بن المسیبؒ،امام زین العابدین علی بن الحسینؒ کے شاگرد اور امام مالک، امام سفیان ثوری،امام اوزاعیؒ،امام سفیان بن عیینۃؒ جلہ فقہاء کے استاذ ہیں۔امام ذہبی الامام الحجة القدوة کے لقب سے ان کا ذکر کرتے ہیں۔۱۳۶ھ میں وفات پائی۔(سیر اعلام النبلاء)۔(۶۳)المصنف لابن أبی شیبة : ۲۶۴/۵۔(۶۴) حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ مشہور تابعی،خلیفہ راشد،فقیہ اور عابد وزاہد تھے۔ان کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔امام ذہبی ان کو الامام الحافظ العلامة المجتهد الزاهد العابد لکھتے ہیں۔۱۰۱ھ میں وفات پائی۔(سیر اعلام النبلاء)۔(۶۵) المصنف لعبد الرزاق: ۸۶/۱۰۔(۶۶) تهذیب الآثار للطبری : ۳۹/۱۔(۶۷) حضرت قتادہ بن دعامہ سدوسی رحمہ اللہ تابعی ہیں۔حضرت انس بن مالکؓ،عبداللہ بن سرجس مزنیؓ،ابو الطفیل کنانیؓ وغیرہ کے شاگرد ہیں۔ابوایوب سختیانی،امام شعبہ،امام اوزاعی وغیرہ کے استاذ ہیں۔امام ذہبی ان کو حافظ العصر، قدوة المفسرين والمحدثين کا لقب دے کر لکھتے ہیں۔کان من أوعية العلم وممن يضرب به المثل فی قوة الحفظ ۔۱۱۸ھ میں وفات پائی۔(سیر اعلام النبلاء)۔(۶۸) المصنف لعبد الرزاق : ۱۴/۱۰۔(۶۹) حضرت عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ تابعی ہیں۔حضرت عائشہؓ،ام سلمہؓ،ابوہریرہؓ،عبداللہ بن عباسؓ،عبداللہ بن عمرؓ،معاویہؓ وغیرہ صحابہ کرام کے شاگرد ہیں۔ابوایوب سختیانی،قتادہ،امام زہری،امام جعفر صادق،امام ابوحنیفہ،امام لیث بن سعد وغیرہ کے استاذ ہیں۔امام ذہبی الامام شيخ الاسلام مفتی الحرم کے لقب سے ان کا ذکر کرتے ہیں۔۱۱۵ھ میں وفات پائی۔(سیر اعلام النبلاء)۔(۷۰) المصنف لعبد الرزاق: ۱۳/۱۰۔(۷۱) بداية المجتهد لابن رشدالقرطبی : ۳۰۱/۲۔(۷۲) شرح معانی الآثار للطحاوی: ۱۷۵/۳۔(۷۳) المختار للموصلی: کتاب الجنایات ۔(۷۴) الدرالمختار للحصکفی: کتاب الجنایات باب القود فيما دون النفس ۔(۷۵)المؤطا للإمام مالک : ۸۷۴/۲۔(۷۶) الکافی لابن عبد البر : کتاب القصاص و الدیات ۱۰۹۹/۲۔(۷۷) کتاب الأم للشافعی:۱۰/۶۔(۷۸) المجموع شرح المهذب للنووی : ۴۷۸/۱۸۔(۷۹)الإنصاف للمرداوی: ۵/۱۰۔(۸۰) تفسیر جامع البیان للطبری : ۳۵۷/۳۔ (۸۱) نیل الاوطار: کتاب الدماء، باب فضل العفو عن الاقتصاص والشفاعة فی ذلک ۱۱۱/۷۔

علامہ شبلی نعمانیؒ

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی

شبلی ایک عبقری شخصیت کا نام ہے۔ان کی عبقریت کی مختلف جہات ہیں،ان جہات میں بڑی رنگا رنگی ہے۔ان کا نام آتے ہی زبان وقلم ان کے علمی کارناموں اور تحقیقی فضیلتوں کے اسیر ہوجاتے ہیں، شخصیت وشخصی عبقریت اوجھل ہوجاتی ہے فکرونظر اور تحریر وتجزیہ کا ایک بشری المیہ یہ بھی ہے کہ ہر شخص اور ہر صاحب قلم اپنے اپنے زاویہ فکر اور نوک قلم کے مطابق چلتا ہے۔ شبلی کی شخصیت کی تہہ داری کی جستجو وتحقیق میں بھی اور ان کی فکری عبقریت اور تحقیقی صلاحیت کے تحلیل وتجزیہ میں بھی اسی کی کارفرمائی ملتی ہے۔مداحوں اور تحسین شناسوں کا دوسرا المیہ ہے۔وہ شخصیت اور اس کے کارناموں میں صرف حسنات پر نظر رکھتے ہیں اور جان بوجھ کر رکھتے ہیں (۱)۔ جس طرح ناقدوں اور شبلی شکنوں کو صرف ان کی شخصیت کی بوالعجبیاں اور طرفہ طرازیاں اور علمی جہت میں خرابیاں وخامیاں ہی نظر آتی ہیں (۲)۔ بقول شبلی مدلل مداحی (۳) کرنے والوں اور حسد کے مارے ناقدوں اور طعن وتشنیع سے آلودہ قلموں کا ایک وطیرہ سچ میں جھوٹ ملانے کا بھی ہے دونوں کہیں کہیں تنقید وتجزیے کے چھینٹے مار دیتے ہیں اور کہیں کہیں تعریف وتحسین کے بخیے بھی لگا دیتے ہیں کہ معروضی ومنصف سمجھے جائیں ، بلاشبہ اس عالم ناسوت میں بشریت کے تقاضوں کے جبر سے کلی معروضیت اور کامل غیر جانبداری ایک امر محال ہے لیکن منصفانہ تجزیہ اور صادقانہ تبصرہ کیا جاسکتا ہے اور کیا بھی گیا ہے، اگرچہ ان میں بھی مبصروں اور تجزیہ نگاروں کا خیال جاری رہتا ہے۔(۴)

الامین ۶۴، احمد نگر، سول لائنس علی گڑھ، ا۔

شخصیت وعبقریت کے اس عظیم پیکر اور علمیت وتحقیق کے اس معلم اول پر ہمارے معاصر زمانے میں بہت کام ہوا ہے۔شبلی کے عظیم وجلیل شاگردوں، دوستوں اور تحسین شناسوں میں سید سلیمان ندویؒ کی حیات شبلی ایک جامع ترین مصدر ہے۔ ناقدوں، تبصرہ نگاروں اور شبلی شکنوں کے تنقیدات، تبصرے اور شکن آلود اشارات ان کے دماغوں کی طرح پراگندہ ہیں (۵)۔ مدح و قدح کے ان تمام مرقعوں کا تجزیہ وتحلیل کرنا اس خاکسار راقم کا مطمح نظر ہے اور نہ وہ اس کو صحیح نگارش سمجھتا ہے۔شبلی کے خیال سے وہ بھی متفق ہے کہ ان دریدہ دہنوں اور دریدہ قلموں کا جواب نہ دیا جائے ورنہ وہ یہ سمجھیں گے کہ ہم بھی کسی قابل ہیں۔اس مرقومہ میں شبلی کی شخصی وعلمی عبقریت کے وسیع جہان فکر ونظر کے داخلہ کی صرف ایک کلید سے کچھ دریچے کھولے جارہے ہیں۔

شخصیت وبشریت کے خاص عناصر: تمام دوسرے انسانوں کی مانند شبلی اپنے اسلاف، آباء واجداد کے خون وروایت کے وارث تھے۔تعلیم وتربیت کے ذریعہ ان کے ذہن ودماغ میں معاصر سماج کے افکار وخیالات خاندانی بزرگوں اور استاذوں کے داخل ہوئے، بالکل اسی طرح جیسے جسم وبدن کی نشو ونما اور بالیدگی میں ماحول، فضا اور ارد گرد کے عناصر نے اپنی اپنی جگہ حصہ لیا اور کام کیا تھا۔ ددھیال کے جدامجد شیوراج سنگھ کے راجپوتی خون کے اثرات نے ان کے جسم و جان کے ساتھ دماغ کے خلیوں میں بھی کارگذاری کی تھی۔اسی طرح ننھیال کے انصاری شیوخ خاص کر شبلی کے نانا حاجی قربان قنبر انصاری کی خون وسماج کی روایت نے تاثیر کی تھی۔شیوراج سنگھ کے شیخ سراج الدین بننے کے اسلامی عمل نے بقول سید سلیمان ندویؒ شبلی خانوادہ کو خان کی بجائے شیخ بنایا تھا۔ والدین شیخ حبیب اللہ اور دختر قربان قنبر انصاری کی تعلیم وتربیت اور افکار و خیالات نے شبلی کی شخصیت سازی میں بڑا حصہ لیا۔والد ماجد سے سیر چشمی، فیاضی، سخنوری، وجدانی کیفیات کے علاوہ نام محمد شبلی پایا جو مشہور صوفی کا لقب وعرف ہے۔ والدہ ماجدہ سے سحر خیزی کی عادت، معمولات کی پابندی اور مادر دلگیر کی غمزدگی بھی پائی اور ''شبلی غمزدہ'' بھی کہلاتے رہے۔ اپنے اسلاف اور آباء واجداد کے ساتھ ساتھ والدین ماجدین سے غیر معمولی ذہانت، طباعی، حسن ذوق وشرافت پائی۔ ذوقعدہ ۱۲۷۴ھ/مئی (جون) ۱۸۵۷ء میں عین اس دن ورود مسعود ہوا جس دن ہندوستانی مجاہدوں نے انگریزی حکومت کے خلاف جہاد کیا تھا۔عجب نہیں کہ اس حسن اتفاق

نے شبلی کو وطن و وطنیت کا عاشق اور غیر ملکی تسلط کا مخالف بنانے میں اثر ڈالا ہو۔ ناز و نعم کی تربیت اور والدین اور گھر کی فضا نے شبلی کے جسم و جاں کے ساتھ ذوق و مذاق کو بھی اسی قدر سنوارا تھا۔ والدین کی مذہبیت نے شبلی کو علم دین کی خدمت کے لیے وقف کرنے کا فیصلہ کیا کہ پہلوٹھی کی اولاد کے بارے میں یہی سماجی ریت تھی۔ قرآن پاک، اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم کے زمانے میں ان کو کتب فروش کی دکانوں میں جانے اور کتابیں کھنگالنے کا چسکا لگا۔ مدرسہ عربیہ اعظم گڈھ میں عربی کتابوں کی تعلیم پائی۔ وہ مولانا علی عباس چریا کوٹی اور مولانا ہدایت اللہ خاں جونپوری سے بھی مستفید ہوئے۔ بقول شبلی و سلیمان ان کے اصل استاد مولانا محمد فاروق چریا کوٹی چشمۂ رحمت غازی پور میں اور پھر اعظم گڈھ میں بنے۔ ان تمام اساتذہ سے خاص معقولات کی تعلیم و تربیت پائی اور اسی سے منطقی ذوق پایا اور فارسی شعروادب سے ادبی مذاق ملا۔

درسیات کی رسمی تعلیم کی تکمیل کے بعد شبلی نے عربی ادب، فقہ و حدیث اور قرآن و تفسیر کا خاص درس لیا۔ روایات عصر کے مطابق وہ رامپور میں مولانا ارشاد حسین کے تبحر فقہ سے نہ صرف مستفید ہوئے بلکہ ان ہی کی طرح سخت حنفی بنے۔ ان کی حنفیت کو ابھارنے اور پروان چڑھانے میں ان کے استاذ اعظم مولانا فاروق چریا کوٹی کا بہت دخل تھا اور انہوں نے ہی محمد شبلی کو شبلی نعمانی بنایا تھا۔ مدتوں شبلی اپنے کو شبلی نعمانی کہلاتے اور لکھتے رہے اور اس پر فخر و ناز بھی کرتے رہے۔ یہ فقہی رنگ اور فقہِ حدیث کا تبحر ایسا چڑھا کہ تعلیمی اور تخصصی دور کے اخیر میں محدث وقت مولانا احمد علی سہارن پوری سے علوم حدیث میں تخصص کے باوجود چوکھا رہا۔ وہ فقہ و حدیث کے تعامل و تفاعل اور ان کے اشتراک سے اسی زمانے میں واقف ہوئے۔ مولانا فیض الحسن سہارن پوری سے عربی ادب میں تخصص کے ساتھ ادبی مذاق پایا اور عربی انشاء و بلاغت پر بڑی قدرت حاصل کی۔ ان سے زیادہ شبلی نے قرآن مجید کی بلاغت و ادب کا ذوق پایا اور قرآن کی وہ تفہیم حاصل کی جو روحِ ام الکتاب ہے۔ ان عظیم اساتذۂ فقہ و حدیث و قرآن سے شبلی نے علم و عمل بھی پایا اور علماء کا وقار و انکسار بھی خوب سیکھا۔

ماحول و علمی فضا نے ان کو شروع میں مناظرہ بازی سکھائی اور مخالفین سے کلامی تیغ زنی بھی۔ مگر جلد ہی وہ اس سے برگشتہ ہوگئے۔ حدیث اور علوم حدیث کی تکمیل کے بعد ہی شبلی کو

حرمین شریفین جانے اور حج کرنے کی سعادت ملی، انیس سالہ شبلی کے دل و دماغ اور قلب ونظر میں بیت اللہ اور روضہ نبویؐ ایسے سمائے کہ زبان وقلم پر ہمیشہ چھائے رہے۔ روضہ اطہرؐ کے سامنے فارسی اشعار پڑھے جن میں ''سایۂ لطفی'' اور ''کرم نبوی'' کی نوازش کی امیدواری کی اور جو بالآخر مل بھی گئی۔ سفر حج کے اثر انگیز واقعات وآثار نے ان کے دل میں گھر بنایا تو حرمین کے کتب خانوں کی خاک چھاننے میں فنون حدیث کا ذخیرہ پایا۔ والدین خاص کر خاندانی مشغلۂ وکالت سے طبعی رغبت نہ تھی، تعمیل ارشاد میں امتحان دیا اور ناکامی کا تمغہ پالیا۔ وکالت وملازمت اور تجارت کے ناکام تجربوں کے بعد شبلی کی اصل زندگی کا دور اس وقت شروع ہوا جب وہ علی گڑھ پہنچے، سرسید کی شخصیت اور کام سے شبلی کی اثر پذیری تو ۱۸۸۱ء کی ہے اور اس کا اظہار ان کے عربی قصیدہ میں خوب ہوا ہے مگر شبلی کی علمی شخصیت کی تعمیر وتشکیل کا زمانہ ۱۸۸۳-۱۸۹۹ء کے سولہ سالہ قیام علی گڑھ کا عرصہ ہے جب شبلی شبلی بنے۔(۷)

شعر گوئی اور نثر نگاری: جودت طبع، فیضان تربیت اور اکتساب علم وفن نے شبلی میں شعر گوئی اور نثر نگاری کی صلاحیت لڑکپن میں پیدا کر دی تھی۔ نثری وشعری صلاحیتوں کا اظہار بھی اسی فطری میلان کے سبب ہوا۔ دونوں پر ماحول وفضا اور تعلیم وتربیت کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ اس پر عام روایت علماء کے مطابق مشغلۂ تدریس سے ان کی وابستگی کا بھی وسیع اثر تھا کہ تصنیف کا اس سے قریبی ارتباط ہے۔ مشہور مفسر قرآن کریم مولانا حمید الدین فراہیؒ، جو شبلی کے ماموں زاد بھائی تھے اور ایک دوسرے عزیز محمد سمیع وغیرہ ان کے شاگرد تھے۔ علوم وفنون میں تدریس تو شعر وادب، متن وتفسیر قرآن، فارسی وعربی انشا وغیرہ کی کرتے تھے اور ان میں مذاق علمی پیدا کرتے تھے۔ شعر وشاعری کے شغل دوم میں فارسی، اردو اور عربی میں قطعے، قصیدے لکھتے تھے اور موقع محل کی مناسبت سے بھی کہتے تھے۔ نثری تصنیف میں حنفی تصلب کی وجہ سے اور ابتدائی مناظرانہ مزاج کی بنا پر بھی فقہی مجادلات میں حصہ لیا اور چار پانچ کتابچے، رسالے لکھے۔ وہ اصلاً ترک تقلید کے داعیوں اور مبلغوں کی پر جوش مساعی کے مناظرانہ جواب میں لکھے گئے تھے اور خاص حالات کے نمائندہ تھے۔ شبلی کے شاگرد وسوانح نگار نے ان میں سے ایک رسالہ کے مواد واسلوب کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور اس کے خصائص بیان کیے ہیں۔ ان کے مطابق ''اس کی زبان بہت

ہی ادیبانہ ہے''اور بعض حنفی علماء ومحققین کے افکار وتحقیقات سے بھی اختلاف کیا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ کا بیان ہے کہ''اس رسالہ میں بھی وہ دو باتیں جوان کے فضل وکمال کا طرۂ امتیاز تھیں، موجود ہیں: ایک منطقیانہ ترتیب وحسن استدلال اور دوسری عربی انشاء پردازی''۔ علی گڑھ قیام سے قبل قصیدۂ سرسید میں بھی زبان وانشاء کے یہی تیور موجود ہیں۔(۸)

مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں''اسسٹنٹ عربک پروفیسر'' کے عہدے پر تقرری کے بعد فارسی وعربی دونوں کی تدریس کی۔ زبان وادب کے علاوہ''قرآن پاک اور دینیات کا درس بھی دینے لگے''۔ بعض ذہین وفطین طلباء کو خاص طور سے قرآنی علوم کا درس دیا۔ نصابی ضرورت کی تکمیل کی خاطر شبلی نے سیرت نبویؐ پر ایک مختصر رسالہ لکھا جو ان کی تصنیفی زندگی میں نئے آغاز کا عظیم سرنامہ ہے۔ شعروشاعری ان کا محبوب مشغلہ تھا اور اس زمانے میں وہ غمزدہ شبلی تھے کہ کرب ایجاد وطباعی سے گذرتے تھے۔ مدرسۃ العلوم کی جدید آب وہوا نے شبلی کے دماغ وقلب میں سرایت کرنا شروع کیا اور وہ جدید علوم کی افادیت کے قائل ہوگئے اور اسی کے ساتھ اپنی قدیم وراثت کے امین بھی بنے رہے، سرسید سے تعلقات اور ان کی تحقیقات میں تعاون کی بنا پر خود خزانۃ الکتاب بن گئے۔(۹)

جدید علوم وفنون کے فضلاء کی فہم کو سطحی اور ان کی تعلیم وتربیت کو ناقص گردانتے تھے اور سخت نقد کرتے تھے، اسی کے ساتھ وہ انگریزی زبان کی تعلیم وافادیت کے بھی قائل تھے اور اسے مسلم نوجوانوں کے علاوہ علماء کے لیے بھی ضروری قرار دیتے تھے۔ مدرسۃ العلوم کے اساتذہ سے علمی ومجلسی اختلاط اور سرسید کی تحقیقات میں امداد ومعاونت نے ان کو جدید طریق تحقیق کا ذوق بخشا۔ اسی نے بقول سید سلیمان ندوی ان کے تاریخی ذوق کو ابھارا اور ڈاکٹر جی ڈبلو لائٹنر (G.W.Laitner) کی کتاب محرک اول ثابت ہوئی۔ سرسید کے عظیم کتب خانے میں عرب تاریخ اور اسلامیات کی بے بہا کتابوں نے ان کو ایسا کھینچا کہ وہ دن رات ان میں فنا رہتے (۱۰)۔ بقول سید ندوی، شبلی نے''پہلے پہل ایک مکمل اسلامی تاریخ'' لکھنے کا منصوبہ بنایا، پھر وہ گھٹ کر تاریخ بنی عباس تک محدود ہوگیا۔ ۱۸۸۳-۱۸۸۴ء کے عرصے میں وہ خلیفہ معتصم کے حالات تک پہنچ چکے تھے، پھر اس کو چھوڑ کر ہر خاندان کے ایک ایک ہیرو کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا اور اس کو

نامور فرماں روان اسلام کے سلسلہ سے موسوم کیا (۱۱)۔ سرسید اور ان کے کتاب خانے کے علاوہ پروفیسر آرنلڈ (Prof. Arnold) کی ہم نشینی اور اتحاد مذاق نے جدید یورپی تحقیقات علمی سے خاص آگاہی بخشی۔ حیدر آباد کے ایک عظیم عالم سید علی بلگرامی نے بھی شبلی کے مذاق علمی خاص کر جدید علمی تحقیقات سے واقفیت پہنچانے میں خاصا رول ادا کیا (۱۲)۔ شبلی نے اپنی تاریخی تالیفات میں دیباچوں اور مقدموں میں مصادر و مآخذ کی بحث میں جدید یورپی تحقیقات سے استفادہ کا ذکر کیا ہے، جس طرح ان کی علمی خیانتوں اور بے بصیرت تجزیوں کا کچا چٹھا کھولا ہے۔ وہ ان کے توازن مزاج اور ذوق علمی کا شاہد بھی ہے (۱۳)۔ شبلی نے انگریزی اور فرانسیسی زبانوں سے بھی قدرے واقفیت پیدا کر لی تھی اور آرنلڈ وغیرہ سے بعض کتابوں کو سبقاً سبقاً بھی پڑھا۔ دوستوں اور ہم منصبوں سے علمی تعاون کے علاوہ شبلی نے شروع سے اپنے شاگردوں، عزیزوں اور نوجوانوں سے بھی مدد لی وہ شبلی کے لیے ''مفید مطلب ابواب'' کا ترجمہ کر دیا کرتے تھے۔ ان کے ذہن میں علمی تعاون کا دوطرفہ یہ عمل بڑا زرخیز اور مفید تھا (۱۴)۔ ایک صاحب فہم و ادراک استاذ و مربی کی مانند وہ اپنے احباب و اعزہ کی تربیت کرتے تھے اور شاگردوں اور طالب علموں کے ذوق کو جلا بخشتے تھے۔ مطالعہ کے ذوق اور تصنیف و تالیف کے شوق کی یہ استادانہ روش شبلی کا ایک طرہ امتیاز بھی ہے، ایک عظیم عالم و مصنف اور صاحب طرز ادیب نے اسی بنا پر شبلی کو مصنف اور مصنف گر قرار دیا ہے۔ حقیقت میں وہ آدم گر تھے (۱۵)۔ بقول خود شبلی خواص و علماء میں صحیح علمی مذاق پروان چڑھانے کے شخصیت ساز کام کو اپنا خاص مطمح نظر قرار دیتے تھے۔ درس و تدریس، تعلیم و تربیت اور استفادہ و افادہ کے علاوہ ان کی تصانیف کا ایک اجتماعی اور ملی مقصد بھی یہی کارمرداں تھا۔ (۱۶)

مصنف شبلی: سلسلۂ فرماں روایان اسلام، جو ناموران اسلام بھی ہے، مصنف شبلی کا نظری تصنیفی منصوبہ بلکہ خاکہ ہی تھا۔ شبلی نے المامون کے دیباچہ میں ہر خاندان یا سلسلہ میں سب سے ممتاز شخصیت کا انتخاب کیا تھا۔ ایسے ''رائل ہیروز آف اسلام'' دس تھے، اخیر میں یہ وضاحت بھی کر دی تھی کہ ''اس سلسلہ میں ترتیب کی پابندی نہ کر سکا...... آیندہ بھی شاید میں ترتیب کی پابندی نہ کر سکوں لیکن قطعی ارادہ ہے کہ اگر زمانہ نے مساعدت اور عمر نے وفا کی تو اس سلسلے کے کل حصے جس طرح ہو سکے گا پورے کروں گا''۔ المامون کو بہ وجوہ مقدم رکھا اور پھر الفاروق لکھ کر

خلفائے راشدین کے سلسلہ کے ممتاز ترین خلیفہ پر شاہکار کتاب لکھی۔ بقیہ سلسلوں کے ''نامور فرماں روایان اسلام'' کی تاریخ وسوانح نہ لکھ سکے۔اس کی وجوہ اور دقتوں سے اہل قلم واقف ہیں مگر جامع سید ندوی کو شکوہ ہے کہ حضرۃ الاستاذ کسی سلسلہ کو پورا نہ کر سکے اور دوسرے موضوعات و مضامین میں الجھ گئے۔(۱۷)

شبلی وسلیمان جیسے عبقری اہل قلم اور محقق ومصنف خاکسار راقم جیسے اطفال مکتب سے زیادہ جانتے اور سمجھتے تھے کہ مولف کا ذہن وقلم ایک سیدھی راہ پر لکیر کی فقیری نہیں کر سکتا، مضامین وموضوعات کا فیضان عالم غیب سے ہوتا ہے تو منصوبہ دھرارہ جاتا ہے، ایک خاص خیال اور موثر جذبہ، منصوبہ سے سوا اور بسا اوقات وہ مضمون وموضوع رقم کرالیتا ہے جو پہلے حاشیۂ خاطر میں بھی نہ آیا تھا۔عام اہل قلم اور مصنّفین اسے خیال وفکر کا جبر کہیں گے مگر عالم غیب وشہادت کے مومنین دست قدرت کی کاریگری قرار دیں گے کہ قلب رحمان کی دوانگلیوں کے درمیان ہوتا ہے اور جدہر وہ چاہتا ہے ادہر موڑ دیتا ہے، پھر قلب کے ساتھ فکر وقلم کا مڑنا لازمی ہے۔(۱۸)

تصانیف شبلی اور مضامین و مقالات نعمانی کی تاریخی توقیت اور تقویمی ترتیب اس حقیقت کی شاہد عدل ہے۔سوانح نگار شبلی اور دوسرے کتابیات نگاروں نے شبلی کی تصانیف کا توقیتی وتاریخی تجزیہ بھی کیا ہے اور موضوعاتی ترتیب بھی قائم کی ہے۔اولین تصنیف مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم (۱۸۸۷ء) کے بعد المامون دوسری تصنیف تھی (۱۸۸۷ء)، تیسری تصنیف سلسلۂ فرماں روایان سلطنت سے ہٹ کر سلسلۂ فرماں روایان دل میں ''سیرۃ النعمان'' ہے جو فقہ کے امام اعظم ہیں اور سب ان کے عیال (۱۸۹۱ء) درمیان میں سفر نامہ شام وترکی (۱۸۹۴ء)، کلیات فارسی (۱۸۹۳ء) آپڑے کہ قلب وفکر کے علاوہ خیال خاطر احباب بھی باعث تھا۔اس کے بعد اولین منصوبۂ تالیف کے تحت الفاروق، سرسید اور ان کے بعض رفقاء کی سخت بندشوں کے باوجود لکھی (۱۸۹۹ء)، شبلی کا رہوار قلم پھر تاجداران سخن فارسی کی طرف مڑا اور شعر العجم اور علم الکلام کے سلسلوں میں خامہ فرسائی کرنے لگا۔اسی دوران اصل سلسلہ کلام وعلم کلام کو دراز ہوتا دیکھ کر اس کے ایک امام اور ہیرو ''الغزالی'' پر تصنیف پوری کر کے چھاپ دی (۱۹۰۱ء)۔سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے کہ ''مولانا اب تاریخ کے دیکھے بھالے کوچہ سے ہٹ کر فن کلام کی طرف متوجہ تھے......جس کا

ہیولی جولائی ۱۸۹۹ء سے ان کے ذہن میں تیار ہورہا تھا۔ الغزالی کی تحریک ۱۸۹۳ء میں سرسید نے کی تھی جبکہ وہ سرسید کی لائف لکھنے سے گریز کر چکے تھے (۱۹۰۲ء)، اسی کے بعد علم الکلام یعنی تاریخ علم کلام (مارچ ۱۹۰۳ء) اور الکلام یعنی جدید علم کلام کی باری آئی (۱۹۰۴ء)۔ اس کے بعد شبلی کے رہوار قلم نے اس کوچے میں قدم رکھا جس سے بقول سید ندویؒ ان کی طبیعت کو تصوف سے کبھی لگاؤ نہ تھا۔ مگر ایک محرم راز نے عقدہ کھولا کہ الغزالی کی تالیف میں ان کے اصرار پر ''امام ممدوح کی صوفیت کا مطالعہ کرکے ایک باب الغزالی میں اضافہ کیا، مبارک تھا وہ وقت جب ان کی توجہ تصوف کی طرف مائل ہوئی کیونکہ اسی توجہ کا بیش بہا نتیجہ سوانح مولانائے روم ہے (۱۹۰۶ء)۔ مثنوی رومی کا معنوی اثر تھا یا شبلی کی شاعرانہ طبیعت کا بہاؤ کہ اس کے بعد موازنہ انیس و دبیر لکھی (۱۹۰۴ء)، بعض مکاتیب شبلی سے معلوم ہوتا ہے کہ موازنہ انیس و دبیر سوانح مولانا روم سے پہلے لکھی جا چکی تھی اور دونوں کے چھپنے میں کافی وقت لگا۔ اسی زمانے میں حیدرآباد دکن کے سررشتہ تالیف کی ملازمت کے جبر سے کتاب الآلات وغیرہ چند کتابیں بھی لکھیں یا ترجمہ کیں۔ اپنے عزیز شاگرد محمد علی جوہر کے اصرار پر بڑودہ کا سفر کیا اور اورنگ زیب عالم گیر پر چھ قسطوں میں مضمون لکھا جو کتاب بن گیا (۱۹۰۶-۱۹۰۸ء)۔ سید ندوی اور محمد علی جوہر کا مشترکہ بیان ہے کہ اسی سفر کے درمیان موخرالذکر نے شبلی کو سیرۃ نبویؐ کی تالیف پر آمادہ کیا۔ مختلف قومی معاملات پر تقریروں کو کتابی روپ دیا اور جرجی زیدان کی تمدن اسلامی کا ردشاندار عربی میں لکھا (ستمبر ۱۹۱۱ء)، اس تمام سلسلۂ تصنیف و تالیف کا حسن اختتام سیرۃ النبیؐ کی تالیف پر ہوا جو چند مباحث کے سوا پوری ہوگئی تھی اگرچہ اس کی ناتمامی کا داغ ان کو عالم نزع میں بھی ستاتا رہا۔ وہ منصوبۂ سیرت کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکے تاہم سیرت کا بنیادی کام دو جلدوں میں کر چکے تھے اور اس سے زیادہ وہ مجلس تالیف سیرت اور سیرت دفتر/ اکادمی بنانا چاہتے تھے (۱۹۱۲-۱۹۱۴ء)۔ (۱۹)

مختلف تصانیف کا بیک وقت منصوبہ اور تالیف: مولفین و مصنفین بالخصوص کثیر التصانیف صاحبان قلم کا ایک مشترکہ تجربہ ہے کہ وہ ایک زمانے میں مختلف تصانیف تیار کرنے کا ڈول ڈالتے ہیں اور چھوٹے بڑے وقفوں میں کئی کئی کتابیں، رسالے اور مضامین لکھتے اور چھاپتے بھی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تصانیف کے تجزیاتی مطالعہ میں اس تجربہ مولف اور خیال خاطر کے

متعدد واقعاتی شواہد ملے۔(۲۰)

شبلی بھی ایک عبقری مولف اور کثیر التصانیف صاحب قلم تھے اور متعدد موضوعات و مضامین کے متبحر عالم اور عظیم محقق تھے۔ان کی تصانیف کے توقیتی تجزیہ میں یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ وہ بیک وقت مختلف موضوعات ومضامین کا خاکہ بناتے تھے اور وقت کے جبر، قلم وخیال کے حکم اور فیضان غیبی کے اشارے پر ان پر خامہ فرسائی کرتے اور کئی کئی کتابیں لکھتے جاتے تھے۔ کتاب وموضوع کا خیال اکثر و بیشتر پہلے بہت پہلے وارد ہوتا، ذہن وفکر اس کا منصوبہ تالیف و ترتیب بناتا اور قلم اس کی اطاعت کرتا۔ابھی ایک موضوع تمام نہ ہوتا کہ دوسری یا تیسری یا کئی کئی تالیفات کا خیال جڑ پکڑ لیتا اور دوسرا کام شروع ہوجاتا، کسی ایک کتاب وتالیف کی تکمیل میں دقتیں آجاتی تھیں تو دوسری اور تیسری کتاب شروع ہوجاتی اور بسا اوقات تکمیل کو پہنچتی، کئی تصانیف شبلی کی تکمیل پہلے ہوگئی مگر طباعت کے مرحلوں کی دشواریوں نے ان کو موخر کردیا اور موخر کو مقدم کردیا۔ ان کے اپنے بیانات کی بنا پر تذکرہ نگاروں نے متعدد تصانیف کی ابتداء وتکمیل کے درمیانی مرحلوں کا ذکر کیا ہے اور ان کے خیال و فیضان کے ارتقاء کا بھی۔ان کا رہوار فکروعزم جس طرح سلاسل تصنیف کے منصوبے بناتا اسی طرح ان کے اندر کافی تبدیلیاں اور ترمیمیں بھی پیدا کرتا تھا۔ المامون، الفاروق، الغزالی، علم الکلام وکلام، سیرۃ النعمان، سوانح مولانائے روم اور سیرۃ النبیؐ جیسے تمام منصوبوں میں فکری ارتقاء ملتا ہے سلسلۂ فرماں روایان اسلام کے صرف ایک حصہ کی تکمیل کے دوران ہی سیرۃ النعمان کا خیال ایسا حاوی ہوا کہ اس کی تکمیل کر ڈالی۔علم الکلام وکلام کے سلسلہ کی درازی اور وقت طلبی نے اس کے ایک جز والغزالی کو مکمل کرلیا اور اسی دوران تینوں کی تصنیف جاری رہی۔الفاروق کی تصنیف کے طویل عرصے میں سوانح مولانا روم، موازنۂ انیس ودبیر اور شعر العجم پر بھی تالیفی کام کرتے رہے۔اسی طرح آخری شاہکار سیرۃ النبیؐ کی تالیف وتسوید کے دوران کئی مضامین ومقالات اور تصنیفات پر بھی مواد جمع کرتے اور اسے مرتب کرتے رہے۔(۲۱)

شبلی، اعجاز تصنیف: مضامین نو کے انبار عظیم لگانے میں شبلی کے قدیم وجدید طریق تحقیق اور مصادر و مآخذ پر ماہرانہ گرفت کا سب سے زیادہ دخل ہے۔طباعی، ذہانت، جودت فکر ونظر اور بلند خیالی نے بھی ان کا ساتھ دیا تھا اور سرسید کے کتاب خانے کے علاوہ دوسرے کتب خانوں نے

بھی دستگیری کی تھی ۔ یہ تمام اسباب وعوامل اور فیوض و برکات بعض دوسرے معاصرین کو بھی حاصل تھیں لیکن شبلی نے ان سے بھرپور استفادہ کیا۔ان کا تصنیفی جوہر دراصل ان کے اس جذبۂ بیکراں سے مہمیز ہوا تھا جو اسلام اور اہل اسلام کی تاریخ کو سرمایہ فخر بنانا چاہتا تھا۔سلسلہ نامور فرماں روایان اسلام کے منصوبے میں اور متعدد تصانیف کے مقدمات میں اور بہت سے مکاتیب میں شبلی نے اس کا اظہار کیا ہے۔ان کا یہ ادراک وتجزیہ صحیح تھا کہ فلسفہ پر مبنی علم کلام مدتوں سے اپنی افادیت کھوچکا اب تو اس سے وابستہ رہنا کارِ بیکاراں ہے، اسلام اور ملت بیضاء کے دشمنوں نے تاریخ کے میدان کو جدل وجدال کے لیے چن لیا ہے اور اسی کے ذریعہ وہ اپنے تیر چلاتے ہیں۔ سوانح نگار شبلی نے مکاتیب ومقدمات تصانیف کی بنا پر وضاحت کی ہے کہ یورپ کے اس نئے دور میں علم کلام کا مرکز فلسفہ سے ہٹ کر تاریخ کی طرف منتقل ہوگیا ہے۔اس کے بعد ان یورپی مساعی کا ذکر کیا ہے جو اسلامی تاریخ ،مسلم ممالک کی تاریخ اور خاص کر سرور کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ کی ذات پاک ...... اور ان کے خلفائے راشدینؓ ،صحابہ کرامؓ اور سلاطین اسلام کو مورد اعتراض بناتے ہیں اور اس کی انتہا یہ کی کہ اسلام اور اسلامی تہذیب وتاریخ کی اساس قرآن مجید کو اعتراضوں کا اور شبہات کا ہدف بنایا۔ بقول سلیمان ندویؒ ’’ایسے ہوش مند حریفوں کے مقابلہ کے لیے ساری دنیائے اسلام سے جو شیر دل اسلام کی صف میں سب سے پہلے نکلا وہ مولانا شبلی ہی تھے ، جنھوں نے ان ہی کے طریقے سے ان ہی کے اسلوب پر ان کو جواب دینا شروع کیا......‘‘ (۲۲)۔اس پر یہ اضافہ ضروری ہے کہ شبلی کا طریق کلام مجادلانہ ،مناظرانہ اور الزامی نہ تھا بلکہ وہ مثبت طریقے سے تحقیقی وعلمی مضامین وتصانیف پیش کرنے لگے ،ان کا مقصد وطریق یہ تھا کہ وہ تاریخ وتہذیب اسلامی کے مختلف موضوعات پر تحقیقی وعلمی چیزیں پیش کریں جو اصل مآخذ پر مبنی ہوں اور تاریخی استدلال اور واقعاتی شہادتوں کے ذریعہ حریفوں کے تار و پود کو بکھیر دیں اور ان کے ہفوات کی قلعی کھول دیں ۔ یورپی یا جدید دشمنوں وحریفوں پر ان کا نقد واستدراک ضمنی رہتا ہے ،اصل میں یہ شخصیت وعہد اور تہذیب وتمدن کی بازیافت کا طریق تھا۔

مثبت طریق اور علمی وتحقیقی انداز کا بڑا دوررس نتیجہ نکلا ۔ اسے بلاشبہ کثیر الجہات اثر کہا جاسکتا ہے ۔اس کی عظیم ترین جہت تو بہت سے اصل مصادر و مآخذ سے جن میں راست و بالواسطہ

دونوں شامل تھے، مواد کی فراہمی تھی (۲۳)۔ شبلی نے جدید یورپی طریق تحقیق کے اس کمال فن کا اعتراف کیا ہے اور اس سے اپنے استفادہ اور اخذ وقبول کا بھی احسان مانا ہے (۲۴)، ان کا یہ بیان ہرگز مبالغہ آمیز نہیں ہے کہ ہر ایک تصنیف کے مواد کے حصول کے لیے ان کو سیکڑوں مآخذ کے ہزاروں صفحات الٹنے پڑے، اسی جہت کا یہ اولین اور فکر انگیز حصہ تھا کہ انہوں نے زیر خیال اور زیر قلم تالیف کے لیے تمام ممکنہ مآخذ کا پتہ لگایا اور ان کو مختلف کتاب خانوں میں تلاش کیا، ان کا مطالعہ کیا اور ان سے ضروری معلومات بھی حاصل کیں اور ہر طرح سے ان کو حاصل کیا۔ شبلی کی لڑکپن کی عادت کتب بینی اور کتب خانہ تلاشی ہر عمر و ہر مقام پر جاری رہی، سفر وحضر کے علاوہ وہ قیام حرمین میں بھی اس سے باز نہ آئے (۲۵)۔ ایک صاحب طرز ادیب و بلند خیال محقق کا تبصرہ بالکل صحیح ہے کہ وہ مصنف ومحقق میدان مار لیتا ہے جو زیادہ مآخذ پر دسترس رکھتا ہے، وجہ بالکل ظاہر ہے۔ وہ ان راست مآخذ اور بالواسطہ مصادر سے معلومات واخبار اور واقعات وحقائق کا انبار عظیم جمع کر لیتا ہے، دوسری عظیم و لازمی جہت تحقیق یہ ہے کہ وہ ضروری معلومات اور کارآمد روایات واخبار کو قبول وجمع کرے اور بیکار وغیر مفید کو مسترد کردے۔ شبلی میں یہ دوسری صفت تحقیق ان کے مطالعہ اور غور وفکر اور تقابلی مطالعہ مصادر ومآخذ نے پیدا کردی تھی جس سے دوسرے محروم تھے، وہ دراصل مواد کی ترتیب وتحلیل اور تنقید وتجزیہ کی شرط تحقیق ہے جس کو اول اول اردو میں شبلی نے برتا اور فنی طور سے برتا۔ یہی وجہ ہے کہ شبلی کی تمام تصانیف میں مختلف روایات میں سے متصادم ومتضاد روایات پر محاکمہ ونقد ملتا ہے اور صحیح کو غلط سے تمیز کیا جاتا ہے۔ شبلی کی تجزیہ مصادر اور تحقیق روایات واخبار کی یہ عظیم جہت نادر ہے اور ابھی تک علماء اور دوسرے اہل قلم بیشتر حالات میں محروم ہی ہیں۔ تیسری شاندار جہت متعدد روایات واخبار میں جمع وتطبیق کی ہے، وہ چند کلیوں پر قناعت نہیں کرتے، بساط بھر روایات واخبار جمع کرتے اور ان کے مجموعی تناظر میں صورت حال کا تجزیہ کرتے ہیں۔ وہ احادیث وآیات میں بھی اسی مجموعی تناظر میں مطالعہ واستدلال کرتے ہیں، استدلال شبلی کا زاویہ روایت پرست علماء واہل قلم کے لیے سوہان روح ہے کہ وہ بہت سے اماماں حدیث وتفسیر کی خامی اجاگر کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کا موقف تحقیق اور طرز نگارش حقیقت کی بازیافت وتصویر کشی ہے، نہ کہ کسی امام وفقیہ اور محدث ومفسر کی ہر رائے کی تقلید (۲۶)۔ استدلال

شبلی میں منطقی ترتیب اور حسن بیان کو بہت زیادہ دخل ہے کہ وہ ان سے بڑا کارگر وموثر اور دلنشیں کام لیتے ہیں۔ المامون، الفاروق، الغزالی، سیرۃ النعمان، سیرۃ النبیؐ کے علاوہ ادبی وکلامی تصانیف میں بھی شبلی نے اسی طریق کو خوب برتا ہے۔ تصنیف وتالیف میں زبان واسلوب کو اولین جزء اعجاز کا درجہ حاصل ہے حتیٰ کہ قرآنی اعجاز کا موثر ترین حصہ اس کی زبان میں مضمر ہے۔ اگرچہ شبلی اردو زبان کی علمی بے مائیگی اور تحقیقی فروتنی کے شکوہ کناں تھے تاہم وہ اس کو دوسری علمی وتحقیقی زبانوں کے ہم پلہ بنانا چاہتے تھے۔ انہوں نے سرسید اور دوسرے محسنین اردو سے کسب فیض کیا تھا اور ان کی لسانی خدمات وعطایا کے معترف واحسان مند بھی تھے مگر ان کے طباع ذہن وادراک نے اور شعروادب کے متوالے قلب ونظر نے ان میں سے کسی کی پیروی نہ کی اور خود اپنی زبان پیدا کی، تمام تصانیف شبلی میں ان کا خاص اسلوب وطرز ادا ہے جو المامون سے سیرۃ النبیؐ کے بیس سالہ مراحل میں ارتقاء کرتا اور نکھرتا گیا۔ زبان واسلوب شبلی میں شعری رعنائی اور ادبی برنائی کے ساتھ ساتھ تاریخی حقائق کو واضح، منطقی اور محکم بیان کی صفات پوری طرح موجود ہیں۔ وہ محمد حسین آزاد کی افسانوی زبان کو تاریخی مضامین اور تحقیقی موضوعات کے لیے مناسب نہیں سمجھتے تھے اگرچہ ان کی ہوائی کو وحی بھی کہتے تھے۔ سرسید وحالی کی زبان واسلوب بھی ان کے نزدیک مناسب وموزوں نہ تھا کہ ان کی سادگی وبے لطفی دلنشینی سے خالی تھی۔ زبان واسلوب شبلی نے اردو زبان وادب کو اپنے ارتقاء کے ایک قابل فخر مرحلہ سے ہم کنار کیا اور تصانیف شبلی کو طرۂ افتخار بخشا۔ مواد ومعلومات کی جمع وتدوین، تحلیل وتجزیہ اور نگارش وپیشکش میں جس طرح وہ جاں سوزی کرتے تھے اور قلب گدازی کرتے تھے (۲۷)۔ اسی طرح وہ اپنی تالیف وتصنیف میں زبان کی تراش خراش اور اسلوب وبیان کی درستگی وآراستگی کی بہت کوشش کرتے تھے، ان کے تمام مقالات ومضامین اور خاص کر ان کی علمی وتحقیقی تصانیف کے بیشتر مقامات کانٹ چھانٹ اور ردوبدل کے شکار ہوتے تھے۔ ان کے اپنے بیانات کے علاوہ ان کے مسودات ان کی تسوید ونگارش کے طریق کی گواہی دیتے ہیں کہ وہ برابر ان میں اصلاح کرتے تھے۔ اگرچہ طباعت اور اشاعت کے مراحل مطبع اور طباعت خانوں کے کارکنوں کے معاملات تھے مگر شبلی ان میں بھی دخل دیتے تھے، وہ حسن کتابت اور جمال طباعت کی کاریگری اور کارسازی کے اعجاز سے اپنے شعری مذاق

اور معیار جمال کی بنا پر واقف تھے۔ اس لیے ان کی تمام تصانیف عمدہ طباعت کے تمام محاسن سے آراستہ ہوتی تھیں، معیار شبلی سے فروتر ہوتیں تو کرب ناک بن جاتیں۔ (۲۸)

اعتدال و توازن اور سیرت و شخصیت کے حسنات و سیئات کا منصفانہ تجزیہ غالباً سب سے بڑی جہت تحقیق ہے۔ بالعموم سوانح نگار اور سیرت نگار اپنے ممدوح شخصیات کی سیرت نگاری میں صرف ان کے روشن پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں اور تاریک دھبوں سے صرف نظر کر لیتے ہیں۔ تاریخ و تہذیب کی بازیافت میں بھی وہ اپنی چیزوں کی تحسین اور دوسروں کی تحقیر کرتے ہیں (۲۹)۔ سوانح و سیرت نویسی میں شبلی کا پختہ خیال تھا کہ دونوں پہلوؤں کو پیش کیا جائے اور ممدوح کو فرشتہ بنایا جائے نہ ابلیس۔ سرسید کی سوانح عمری ''حیات جاوید'' کو انھوں نے حالی کی بے مہار تحسین کے سبب مدلل مداحی سے تعبیر کیا تھا اور خود لکھنے سے گریز کیا تھا، اپنے عزیز شاگرد سید سلیمان ندوی کو موقعہ و فرصت ملنے پر اپنی سوانح لکھنے کی ہدایت کی تھی کہ مجھے انسان ہی رہنے دینا، فرشتہ نہ بنانا (۳۰)۔ بیشتر سوانح عمریوں میں شبلی نے اپنے ممدوحین کی سیرت و فکر کے دونوں پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے اور نقد و تجزیہ سے بھی گذارا ہے۔ المامون میں ہارون الرشید کے بارے میں چلتا پھرتا تبصرہ کیسا جاندار ہے کہ ''اگر اس کا دامن انصاف برامکہ کے خون سے رنگین نہ ہوتا تو ہم اس کے ہوتے عباسیوں میں سے کسی فرماں روا کو انتخاب کی نگاہ سے نہ دیکھتے'' (۳۱)۔ المامون پر متعدد مقامات پر نقد کیا ہے۔ دوسرے حصہ کی تمہید میں ایسا ہی تیکھا تبصرہ ہے ''ان سب خوبیوں کے ساتھ شخصی حکومت کے اقتدار میں بعض ایسی بے اعتدالیاں بھی اس سے سرزد ہوگئی ہیں جن کے خیال کرنے سے دل کانپ جاتا ہے اور دفعتاً اس کی خوبیاں آنکھوں سے چھپ جاتی ہیں'' (۳۲)۔ خلیفہ المامون اور ان کے پیش رو و جانشین عباسی خلفاء کے زمانے میں اندرونی بغاوتوں، سازشوں اور افراتفریوں پر بھی نقد کیا ہے۔ اموی خلافت کی فتوحات کی تعریف و تحسین کے تناظر میں عباسی فتوحات کی تنگی اور نظام حکومت کی ابتری پر بھی سخت تبصرے ہیں۔ اسراف اور پر تعیش زندگی پر تبصرے بھی ہیں اور سب سے سخت محاسبہ و نقد المامون کے مذہبی موقف اور اس کے بالجبر نفاذ پر کیا ہے (۳۳)۔ الغزالی میں امام موصوف کے مزاج کو ابتداء میں مجادلہ پسند اور نکتہ چیں قرار دیا ہے اور ان کے معاصر کی زبان سے ان کی جاہ پسندی کا ذکر کیا ہے، امام غزالی کی تصانیف پر

تبصروں میں بھی نقد موجود ہے جیسے منخول کی بے باکی اور آزادی، ان کی قصیدہ نگاری کو شان کے خلاف بتایا اور احیاء العلوم پر بھی کئی جگہ نقد کیا جیسے قوت القلوب مکی سے عبارات کا نقل کرنا اور ضعیف و مجروح روایات پیش کرنا اور عزم وثبات سے اس کا خالی ہونا (۳۴)۔شعر العجم اور علم الکلام وغیرہ میں بھی شبلی کی تنقیدات کا وافر حصہ موجود ہے جو ان کے تجزیہ وتحلیل کا ثبوت پیش کرتا ہے (۳۵)۔ قدیم اسلامی مآخذ ومصادر پر شبلی نقد وتبصرہ خاص کر جدید فن تاریخ ارتقاء کے تناظر میں ان کے منصفانہ اور محققانہ ژرف نگاہی کو اجاگر کرتا ہے۔(۳۶)

(باقی)

تعلیقات وحواشی

(۱) شبلی کے مدلل مداحوں کی ایک طویل فہرست ہے جو ان کی شخصیت وکام پر صحیح نقد اور جائز اختلاف بھی نہیں برداشت کر سکتے۔(۲) شخصیت وذات شبلی پر طعن کرنے والے بھی بہت ہیں، علمائے دیوبند اور دوسرے روایتی فضلاء نے ان کی روحانیت پر سوالیہ نشان لگایا ہے، عطیہ فیضی سے ان کے علمی ومعاشرتی تعلقات وروابط پر طعن معاشقہ کی سرحدوں تک پہنچایا گیا، کردارکشی کی اور بھی جہات ہیں۔تصانیف ومقالات شبلی پر شبلی شکنوں اور معاندوں کی تحریریں اور زبانیں ہمیشہ دریدہ اور دراز رہیں، وہ غیر علمی وغیر اخلاقی ہیں، ملاحظہ ہو: احسن مارہروی، کسوف الشمسین، بدایوں ۱۹۱۵ء، محمد امین زبیری، تبصرہ حیات شبلی، بھوپال ۱۹۴۶ء؛ ذکر شبلی، لاہور ۱۹۵۳ء؛ ذکر شبلی ۱۹۴۶ء، وحید قریشی، شبلی کی حیات معاشقہ، لاہور ۱۹۵۰ء، افضل علی ضو، رد الموازنہ، لکھنؤ ۱۳۲۵ھ، ان کے تجزیہ کے لیے ملاحظہ ہو: شہاب الدین دسنوی، شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں، نئی دہلی ۱۹۸۲ء، محمد واصل عثمانی، شبلی نقادوں کی نظر میں، کراچی ۱۹۶۸ء۔(۳) سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، اعظم گڑھ ۱۹۸۳ء بحوالہ مکاتیب شبلی، اعظم گڑھ، ۱/۱۳۴: مولانا حالی کی حیات جاوید کے لیے شبلی نے کتاب المناقب اور مدلل مداحی دونوں کا استعمال کیا ہے۔(۴) مصنّفین بلکہ محدثین کرام اپنے فکر وعقیدہ کے مطابق کتابیں اور رسالے تالیف کرتے ہیں، یہ ایک بدیہی حقیقت ہے جس پر کامل تحقیق ہونی ہے، ناقدین ومبصرین بھی اسی طرح اسیر حلقہ دام خیال ہوتے ہیں اور بسا اوقات حسد وکینہ کے مارے بھی ہوتے ہیں، اس کی طرف کم خیال جاتا ہے، شبلی کے مخلص ناقدوں میں بھی تقریباً سب ہی ایسے ہیں جو اپنے فکری اختلاف اور مذہبی میلانات کے سبب ان

پر نقد کرتے ہیں، معاندین و حاسدین تو اپنے قلب و ذہن کی رذالت ہی کی وجہ سے زبان طعن دراز اور قلم بیہودہ رواں کرتے ہیں۔ ان پر مختصر بحث آگے آتی ہے۔ (۵) فکر و نظر شبلی نمبر، مرتبہ شہریار و محمد صابر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۹۶ء کا اشاریۂ کتابیات مرتبہ ضیاء الدین انصاری، ۳۱۵ و مابعد اور دوسرے کتابیات نامے ملاحظہ ہوں۔ (۶) شبلی نے اپنے ایک شاگرد مولانا عبدالسلام ندوی کو اپنے ایک مکتوب میں صرف اس بنا پر سرزنش کی تھی کہ انہوں نے اپنے استاذ گرامی پر کسی تنقیدی مضمون کا جواب بلا اجازت و اطلاع لکھ مارا تھا۔ (۷) حیات شبلی، ۵۸-۹۱ و مابعد بنیادی مصدر ہے لیکن دوسرے مآخذ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے جیسے ''شبلی غمزدہ'' کا حوالہ رشید احمد صدیقی کے مضمون سے لیا گیا ہے جو مولانا محمد علی جوہر کی زبان سے ایک واقعہ و مشاہدہ کے دوران سے نکلا تھا۔ (۸) حیات شبلی، ۱۰۷-۱۲۰: سید سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ قصیدۂ سرسید میں بعض فنی کمزوریاں ہیں مگر مداحانہ ابتذال نہیں ہے۔ (۹) حیات شبلی، ۱۲۱ - ۱۲۸ و مابعد: سید سلیمان ندوی کے مطابق سرسید ''ہمیشہ اعتقادی اور کلامی مسائل اور مورخانہ تحقیق کے غور و خوض میں رہتے اور تحقیق و تدقیق کے لیے انہیں اکثر حدیث و فقہ اور تاریخ و سیر کی کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت پڑتی، اس کام کو انہوں نے مولانا شبلی سے لینا شروع کیا اور شبلی نے اس خدمت کو ایسی خوبی اور قابلیت سے انجام دیا'' کہ دونوں ایک دوسرے کے کمالات کے معترف ہوگئے۔ (۱۰) حیات شبلی ۱۳۱ - ۱۳۸، مکاتیب شبلی، ۵۶/۱۔ (۱۱) مکاتیب شبلی، ۷۰/۱ حاشیہ مرتب خط بنام مولوی محمد سمیع، تاریخ بنی العباس یا سنین الاسلام میں شبلی خلیفہ معتصم تک لکھ چکے تھے اور اسی پر جلد اول تمام کرنے کا ارادہ تھا۔ سید ندوی نے بھی یہ نہیں بتایا کہ وہ شبلی کا مخطوطہ، مسودہ کیا ہوا۔ المامون، اعظم گڑھ ۱۹۵۷ء، ۸ میں شبلی نے لکھا ہے کہ ''...... میرا ارادہ تھا کہ اسلامی حکومتوں کی ایک مفصل اور بسیط تاریخ لکھوں لیکن مشکل یہ تھی کہ نہ میں تمام خاندانوں کا استقصاء کرسکتا تھا نہ کسی خاص سلسلہ کے انتخاب کی مجھ کو وجہ مرجح ملتی تھی''۔ (۱۲) حیات شبلی، ۱۳۹-۱۴۵، آرنلڈ اور سید علی بلگرامی دونوں کے علم و فضل سے بھی شبلی نے فائدہ اٹھایا تھا اور وہ دونوں بھی شبلی سے مستفید ہوئے تھے، شبلی بہر حال جدید یورپی تحقیقات اور تصانیف کے لیے ان دونوں کے مرہون منت تھے۔ (۱۳) المامون، دیباچہ کی بحث نیز ۱۵۴-۱۵۵ و مابعد نیز حاشیہ نمبر ایورپین مصنّفین خاص کر پامر کی تاریخ ہارون الرشید پر سخت نقد کیا ہے اور ان کی مسخ نگاری اجاگر کی ہے۔ نیز حیات شبلی، ۱۴۵ و مابعد۔ (۱۴) حیات شبلی ۱۴۷ و مابعد؛ مکاتیب میں متعدد دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں سے علمی تعاون و امداد کا ذکر ملتا ہے۔ (۱۵) عبدالماجد دریابادیؒ ''انسان، مصنف، مصنف گر''، نقش کراچی نومبر ۱۹۶۵ء، ۱۱۷-۱۲۴، نیز

دوسرے مضامین و تبصرے ۔ (۱۶) حیات شبلی ، ۳۷ - ۳۸ و مابعد ؛ مکاتیب شبلی ،۲/۱۶۰ا مکتوب بنام مولانا عبدالباری ندوی ۔ (۱۷) المامون ، ۸-۹ ؛ حیات شبلی ۔ (۱۸) خاکسار راقم کا ذاتی تجربہ ہے کہ تصنیفی منصوبہ بدلتا گیا اور بعض مضامین و کتب کسی اور کے حکم و ہدایت پر اچانک لکھی گئیں اور منصوبہ بند تالیفات آج تک نہیں لکھی جاسکیں ، عظیم اہل قلم اور مصنّفین و محققین کے ساتھ اس سے زیادہ حادثہ پیش آیا ہے خود حضرت جامع نے سیرتی منصوبہ شبلی میں کانٹ چھانٹ کی اور آخری جلد نہیں لکھ سکے اور دوسرے کاموں میں الجھ گئے ۔ (۱۹) حیات شبلی میں تصانیف کی تکمیل و اشاعت کا ذکر مختلف صفحات پر ہے : مکاتیب شبلی میں ان سب تصانیف کی تیاری ، تسوید ، خاکہ ، تبییض ، طباعت اور تبصروں پر بھی بہت قیمتی معلومات ہیں جو شبلی کے فکر و نگارش کے مراحل و مشکلات کا بیان بھی ہیں ۔ المامون : ۱/۵۰ ، ۷۰ ۔ سیرۃ النعمان : ۱/۵ ، ۴۷ ، ۴۸ ، ۸۷ ، ۸۸ ، ۹۰ وغیرہ ، بہت مقبول ہوئی اور تین ماہ میں دوسرا ایڈیشن نکلا ۔ سفر نامہ ۔ الفاروق : ۱/۸ ، ۳۰ ، ۴۸ ، ۹۳ ، ۱۱۲ ، ۱۱۵ ۔ الغزالی : ۱/۳ ، ۳۵ ، ۱۰۵ ، ۱۰۸ ، ۱۱۶ ، ۱۱۸ ، ۱۴۰ ، ۱۴۷ ، ۱۴۷ وغیرہ ۔ علم الکلام : ۱/۱۰۶ ، ۱۱۱ ، ۱۳۹ ، ۱۴۰ ۔ سوانح مولانائے روم ۔ شعر العجم : ۱/۱۰۷ ، ۱۵۶ ، ۱۵۹ ، ۱۶۰ ، ۲۱۷ وغیرہ ۔ سیرۃ النبیؐ : ۱/۴۴ ، ۱۰۸ ، ۱۰۹ ، ۱۹۵ ، ۱۹۷ ، ۲۰۰ ، ۲۰۵ و مابعد ؛ ۲ حاشیہ و مابعد ۔ مراحل تالیف پر خاکسار راقم کا مفصل مقالہ ملاحظہ ہو : '' تالیف سیرۃ النبیؐ - پس منظر و پیش کش ، فکر و نظر شبلی نمبر مذکورہ بالا ۱۹۷-۲۳۲ ۔ دفتر سیرت ، سیرت اکادمی کا منصوبۂ شبلی بہت نادر خیال و عظیم منصوبہ تھا جس پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے ۔ (۲۰) محمد یٰسین مظہر صدیقی ، تصانیف شاہ ولی اللہ - ایک تنقیدی تجزیہ ، ادارہ علوم اسلامیہ ، مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ ۲۰۰۹ء ، بالخصوص توقیت تصانیف کے تنقیدی نکات کی بحث ، ۸۵-۹۰ و مابعد ۔ (۲۱) مکاتیب شبلی اور حیات شبلی کے مذکورہ بالا حوالوں سے بیک وقت کئی کئی تصانیف کی نگارش کا پتہ چلتا ہے ۔ (۲۲) حیات شبلی ، ۲۳-۲۵ و مابعد ۔ (۲۳) المامون ۱۲۵ : '' ...... دوسری قسم کے حالات کے لیے مجھ کو ہزاروں ورق الٹنے پڑے ہیں '' الغزالی وغیرہ کے دوسرے حصہ میں بھی یہی اظہار ہے ، مفصل بحث کے لیے خاکسار کا مقالہ '' مآخذ و مصادر کے پارکھ شبلی '' برائے شبلی سیمینار مجوزہ ۱۱-۱۲/ دسمبر ۲۰۱۱ء ۔ (۲۴) المامون ، ۹-۱۰ ، بحث کے لیے مقالہ '' مآخذ و مصادر کے پارکھ شبلی '' پر متعلقہ بحث ۔ (۲۵) حیات شبلی ، ۱۷ ، ۹۲ وغیرہ ۔ (۲۶) المامون ، سیرۃ النعمان ، الغزالی ، الفاروق ، شعر العجم وغیرہ میں شبلی کی اسی تحقیقی روش اور تجزیہ روایات کا ثبوت ملتا ہے ۔ (۲۷) شبلی کی انشا پردازی پر مضامین و مقالات ملاحظہ ہوں جیسے آغا محمد باقر ، شبلی نعمانی بحیثیت نثر نگار ، تاریخ نظم و نثر اردو امرت سر ۱۹۳۳ء ، سید عبداللہ ، سرسید کے اثرات اردو ادبیات پر ، عبدالسلام ندوی ، شبلی کا طرز تحریر ،

عبدالماجد دریابادی کا مذکورہ بالا مضمون اور متعدد دوسرے۔ دارالمصنفین وغیرہ میں شبلی کے متعدد مسودات محفوظ ہیں، ان میں الفاظ وعبارات کی کانٹ چھانٹ موجود ہے، سیرۃ النبیؐ، الفاروق وغیرہ کے بعض اجزاء الہلال اور دوسرے رسائل میں چھاپے تھے اور بعد میں ان میں تبدیلی کردی، مقدمہ سیرۃ النبیؐ اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔ (۲۸) مکاتیب شبلی میں طباعت کے حسن اور عمدگی اور ان کی بنا پر مطابع کا انتخاب ان کا طریق جمال تھا اور ان کا ذکر متعدد مقامات پر ہے۔ (۲۹) یورپی تاریخ وسیرت نگاری کا یہ خاص مقصدی منصوبہ رہتا ہے اور اسلام اور مسلم تہذیب وتمدن خاص نشانہ رہتے ہیں، شبلی نے المامون، الغزالی، الفاروق، سیرۃ النبی کے مختلف ابواب ومباحث میں اور دوسری تحقیقات میں ان پر مدلل بحث کی ہے۔ (۳۰) حیات شبلی، مکاتیب شبلی میں سیرت نگاری کے اصول سے بحث بھی کی ہے اور مشورے بھی دیے ہیں، تاریخی کتب میں بھی ان کا یہ طریق اعتدال وتجزیہ ملتا ہے۔ (۳۱) ہارون الرشید کا برامکہ کو قتل کرانا خلیفہ عباسی کے سخت اقدامات میں سے تھا جس کی مذمت کے ساتھ تحقیق بھی ضروری ہے، برامکہ اپنے تمام علم وفضل اور حسنات وکمالات کے باوجود خلیفہ کے اقتدار اور بیت المال کی امانت کے ساتھ خیانت بھی کررہے تھے، صرف عباسی خلیفہ کو سراسر موردالزام قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ دوسرے ہارون الرشید کے دوسرے سیاسی اور تنظیمی اقدامات بھی ان کے دامن انصاف وعدل پر چھینٹے ہیں۔ (۳۲) المامون کا انتخاب شبلی سراسر ان کے ذوق علمی اور رجحان تصنیفی کا معاملہ ہے ورنہ ہارون الرشید یا المنصور زیادہ مستحق تھے، المنصور کی تمام بےاعتدالیاں اپنی جگہ قابل نقد ہیں لیکن وہ عباسی خلافت کے اصل معمار تھے اور ان کے قد وقامت کا اور کوئی نہ تھا۔ (۳۳) المامون ۱۸-۱۹ ومابعد، ۱۵۵، ۱۹۵ ومابعد اور ۲۰۷-۲۱۴ مامون کا مذہب خاص کر۔ (۳۴) الغزالی، ۲۱، ۲۴، ۳۴، ۳۸، ۴۰، ۴۶ ومابعد۔ (۳۵) شعرالعجم، ۲۶/۱، ۲۶ ومابعد؛ علم الکلام، شعرائے فارسی پر نقد شبلی ہر جگہ موجود ہے۔ عرب شاعری میں قصیدہ نگاری پر سخت تبصرہ ہے کہ شاعری کو صرف تفریح طبع کا ایک مشغلہ سمجھتے تھے (۲۶/۱)، فردوسی کی عرب واسلام دشمنی پر بھی سخت نقد ہے، مآخذ میں تو شبلی تنقیدات بہت ہیں۔ (۳۶) سیرۃ النبیؐ کا مقدمہ خاص کر، المامون، الفاروق، الغزالی، سیرۃ النعمان وغیرہ کے دیباچے، مزید بحث بعد میں آتی ہے، شعرالعجم میں خاص تذکروں اور تاریخوں پر مشتمل مآخذ پر تنقیدات شبلی کو جمع کیا جائے تو ایک تحقیقی مقالہ بن جائے گا، شعراء کے حسن وقبح پر ان کے محاکے ان کے علاوہ ہیں۔

سیرت نبوی ﷺ کے مفقود مصادر

ڈاکٹر جمشید احمد ندوی

(۲)

معمر بن راشد ازدی صنعانی کی کتاب المغازی: معمر بن راشد ازدی صنعانی (م۱۵۴ھ) نے ایک کتاب سیرت بطور یادگار چھوڑی ۔ وہ امام زہری کے شاگرد خاص اور ان کی کتاب المغازی کے راوی ہیں ۔امام زہری کے علاوہ انہوں نے ہشام بن عروہ بن زبیر کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ابن ندیم نے ان کی کتاب المغازی کا ذکر کیا ہے۔انہوں نے عثمان جزری کی کتاب المغازی کے دو جزء نقل کیے تھے جسے انہوں نے عاریتاً کسی کو دیا لیکن اس نے واپس نہیں کیا۔

معمر بن راشد کی کتاب المغازی کے خاص راوی عبدالرزاق بن ہمام صنعانی ہیں (م ۲۱۱ھ) جنہوں نے مغازی کا بیشتر حصہ کتاب المصنف میں محفوظ کر دیا۔

ابن ندیم نے عبدالرزاق بن ہمام صنعانی کی فہرست مولفات میں کتاب المغازی کا بھی ذکر کیا ہے۔قاضی مبارک پوریؒ بھی انہیں قدیم مولفین سیرت میں گردانتے ہیں اور یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ان کی کتاب المغازی ، کتاب المصنف میں چھپ چکی ہے لیکن ہماری ناقص رائے کے مطابق وہ خود مولف سیرت نہیں ہیں بلکہ وہ معمر بن راشد کی کتاب المغازی کے راوی ہیں ۔ ورنہ ہمیں متعدد محدثین کو اس لیے مولفین سیرت ماننا پڑے گا کہ انہوں نے اپنی کتب میں کتاب المغازی کا باب شامل کر رکھا ہے۔

شعبہ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

ابومعشر نجیح کی کتاب المغازی: ابومعشر نجیح بن عبدالرحمٰن سندی مدنی (م ۱۷۰ھ) کا شمار ابتدائی مولفین سیرت میں ہوتا ہے۔ان کی شخصیت اس لحاظ سے منفرد قرار دی جاسکتی ہے کہ وہ پہلے ہندنژاد تھے جنہوں نے عربی میں اولین کتاب سیرت لکھی تھی۔انہیں علم المغازی وسیرت نبویؐ سے خاص شغف تھا۔لہٰذا وہ علمائے مدینہ کی علمی مجلسوں میں حاضر ہوتے اور وہاں جو کچھ سیرت نبویؐ کے متعلق بیان کیا جاتا اسے یاد کرلیا کرتے تھے۔

اساتذہ میں ہشام بن عروہ اور شاگردوں میں امام واقدی اور علی بن مجاہد کابلی رازی (م۱۸۲ھ) جیسے علمائے سیرت شامل ہیں۔

خلیفہ وقت مہدی کی فرمائش وخواہش پر زندگی کے آخری دس سال انہوں نے بغداد میں گزارے اور اسی قیام کے دوران اپنی کتاب المغازی کو مرتب کیا۔ان کی کتاب المغازی کی روایت امام واقدی نے بغداد میں ہی کی تھی۔ان کی کتاب کے خاص راوی ان کے صاحبزادہ محمد بن ابومعشر (م۲۴۴ھ) ہیں۔

کتاب المغازی کو اہل علم وفضل نے قابل اعتنا سمجھا اور وہ ایک زمانہ تک علمی حلقوں میں متداول رہی۔امام ابن سعد نے امام واقدی کے حوالے سے الطبقات الکبری میں اور حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس کے حوالے جابجا دیے ہیں۔

سلیمان بن بلال تیمی کی کتاب المغازی: سلیمان بن بلال تیمی قرشی مدنی (م۱۷۲ھ) کا ذکر عام طور پر مولفین سیرت میں نہیں کیا جاتا ہے حالاں کہ انہوں نے فن سیرت پر ایک کتاب لکھی تھی۔ بقول قاضی مبارک پوریؒ ''تذکرہ نگاروں نے ان کی کتاب المغازی کا ذکر نہیں کیا ہے، حالانکہ وہ کتاب المغازی کے مصنف ہیں اور دوسری صدی کے علمائے مغازی میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری کی کتاب المغازی میں اس کا ذکر واضح طور پر کیا ہے اور اس کی کئی روایات بیان کی ہیں۔سلیمان بن بلال تیمی کے شیوخ میں ہشام بن عروہ اور موسی بن عقبہ جیسے ناموران سیرت شامل ہیں۔

علی بن مجاہد کابلی رازی کی کتاب المغازی: علی بن مجاہد کابلی رازی (م۱۸۲ھ) کا شمار بھی ابتدائی مولفین سیرت میں ہوتا ہے۔ان کے اساتذہ میں ابن اسحاق اور ابومعشر سندی وغیرہ شامل

ہیں۔اگرانہیں ہندنژاد مان لیا جائے تو وہ دوسرے ہندوستانی عربی سیرت نگار ہوں گے جن کی کتاب المغازی کا ذکر مصادر میں ملتا ہے لیکن انہیں ابومعشر جیسی شہرت ومقبولیت نصیب نہ ہوئی۔ان کی بعض مرویات تاریخ طبری میں موجود ہیں۔یحییٰ بن معین ان کی شخصیت اوران کی کتاب المغازی کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔

ابراہیم بن سعد کی کتاب المغازی: ابراہیم بن سعد بن ابراہیم زہری (م۱۸۳ھ) نے سیرت نبویؐ کی تعلیم اپنے والد سعد بن ابراہیم زہری کے علاوہ محمد بن شہاب زہری، ہشام بن عروہ اورابن اسحاق سے حاصل کی تھی اور موخرالذکر کی کتاب کا درس دیا تھا۔اور بعد میں اس میں کچھ حذف وزیادتی کر کے خود اپنی کتاب المغازی لکھی تھی جو بقول قاضی مبارک پوریؒ ابن اسحاق کے دوسرے تلامذہ کی روایت سے کچھ مختلف تھی۔ان کے صاحبزادے یعقوب بن ابراہیم (م۲۰۸ھ) اوراحمد بن محمد بن ایوب وراق بغدادی (م۲۲۸ھ) ان کی کتاب المغازی کے راوی ہیں۔

یعقوب بن شیبہ کی روایت کے مطابق احمد بن محمد بن ایوب وراق بغدادی نے خاندان برامکہ کے کسی فرد کے لیے ابراہیم بن سعد کی کتاب المغازی کی نقل تیار کی تھی اور بعد میں صاحب کتاب کے پاس جاکراس کی تصحیح کی تھی۔

زیاد بن عبداللہ بکائی کوفی کی کتاب المغازی: زیاد بن عبداللہ بکائی کوفی (م۱۸۳ھ) کا شمار ابن اسحاق کے ان اجل تلامذہ میں ہوتا ہے جنہوں نے ان سے براہ راست مغازی کا علم حاصل کیا تھااور بعد میں ابن اسحاق کی کتاب میں حذف واضافہ کر کے ایک مستقل کتاب المغازی لکھی تھی۔ زیاد بکائی کی روایت کو بہت زیادہ اعتبار اس لیے حاصل ہے کہ ابن اسحاق نے اپنی کتاب کوانہیں دوبارااملا کرایا تھااورانہوں نے اسے نقل کرنے کے لیے اپنے بعض مکانات فروخت کردیے تھے۔

امام سمعانی کے بقول بکائی نے بغداد آکرابن اسحاق سے مغازی کی روایت کی اور محمد بن سالم سے اس کوحل کیااوراس کے بعد کوفہ واپس آگئے۔

یہاں یہ وضاحت مناسب ہوگی کہ ابن اسحاق کے براہ راست تلامذہ میں بکائی کی شخصیت اس لحاظ سے منفرد ہے کہ ان سے مروی ابن اسحاق کی مکمل کتاب المغازی ہی آج کی دنیا میں موجود ہے اور سیرت ابن ہشام کے نام سے معروف ومشہور ہے۔ان کے علاوہ ابن اسحاق

کے کسی اور شاگرد کو یہ فضیلت حاصل نہ ہوسکی ۔ ڈاکٹر حمید اللہؒ نے ان کے دوسرے شاگرد یونس بن بکیر اور محمد بن سلمہ سے مروی مغازی ابن اسحاق کو تحقیق وتدوین کے بعد علمی دنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے لیکن وہ زیاد بکائی سے مروی مغازی ابن اسحاق جیسی شہرت وقبولیت حاصل نہ کرسکی ، غالباً جس کی بنیادی وجہ اس کا نامکمل ہونا ہے ۔

زیاد بکائی کی کتاب المغازی مفقود کتب سیرت میں اس لحاظ سے شامل ہے کہ وہ اپنی اصل شکل میں آج موجود نہیں ہے ۔ ابن ہشام سے مروی زیاد بکائی کی کتاب المغازی کو ان کی مکمل کتاب اس لیے نہیں قرار دیا جاسکتا ہے کہ ابن ہشام نے اس میں متعدد مقام پر حذف و اضافہ سے کام لیا ہے ۔

یحییٰ بن سعید اموی کی کتاب المغازی: یحییٰ بن سعید اموی (م ۱۹۴ھ) کا شمار بھی ابن اسحاق کے ان اجل تلامذہ میں ہوتا ہے جنہوں نے ان سے براہ راست مغازی کا علم حاصل کیا تھا اور بعد میں بقول ذہبی ، ابن اسحاق کی کتاب میں حذف واضافہ کے ساتھ ایک مستقل کتاب المغازی لکھی تھی ۔

یحییٰ بن سعید اموی کے کئی تلامذہ نے ان سے کتاب المغازی کی روایت کی تھی ان میں سب سے زیادہ اہم ومعتبر ان کے صاحبزادہ سعید بن یحییٰ (م ۲۴۹ھ) ہیں جنہیں بعض محققین مستقل مولف سیرت گردانتے ہیں ۔

یحییٰ بن سعید اموی کی کتاب المغازی کو بہت زیادہ قبولیت ملی اور ان کے انتقال کے بعد ایک زمانہ تک اہل علم کے نزدیک معروف ومتداول رہی ۔ اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ محمد بن عباس خراز ابن حیویہ بغدادی (م ۳۸۲ھ) نے اس کی روایت کی تھی ۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں متعدد مقامات پر اس کا حوالہ دیا ہے ۔

راقم سطور نے یحییٰ بن سعید اموی کی کتاب المغازی کی مرویات کو مختلف مصادر ومراجع سے جمع کر کے مرتب کیا ہے ۔ راقم سطور کی اس حقیر کاوش پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ عربی کی جانب سے اسے ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا گیا ہے ۔

یحییٰ بن سعید اموی نے اپنی کتاب المغازی کو اپنے استاذ امام ابن اسحاق کے طرز پر مرتب کیا تھا لہٰذا اس کے مباحث کتاب المبتدا والمبعث والمغازی پر مشتمل ہیں ۔ راقم سطور کو یحییٰ

بن سعید اموی کی کتاب المغازی کی حسب ذیل مرویات دستیاب ہوسکی ہیں:

کتاب المبتدأ: حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کا ذکر، قریش کا بنونضر بن کنانہ سے ہونا، قصی بن کلاب کا قبیلہ خزاعہ کا نکالنا، قصی بن کلاب کی شادی، حضرت عبدالمطلب اور بئر زمزم کی یافت نو، بنوعبدالمطلب کا عہدہ سقایہ سے سرفراز ہونا، زمانہ جاہلیت کے متلاشیان حق، زید بن عمرو بن نوفل، عثمان بن حویرث اور ورقہ بن نوفل، آپؐ کی رضاعت، آپؐ کا حرب فجار میں شریک ہونا، ورقہ بن نوفل کا اپنے ایک قصیدہ میں، آپؐ کی بعثت کی امید کا ذکر کرنا (استبطاء ورقة بعثة النبی)، آپؐ کا تعمیر کعبہ میں حصہ لینا اور انہدام کعبہ کے وقت بنیاد کعبہ میں پائی جانے والی کتب۔

کتاب المبعث: ہواتف الجان، اولین مسلمان، ضماد ازدی اور عبداللہ بن جحش وغیرہ دیگر اولین مسلمانان، گھاٹیوں میں نماز کی ادائیگی، ابوطالب کا آپؐ کی حمایت میں قصیدہ کہنا، ہجرت حبشہ، نقض صحیفہ، ابن ام مکتوم کے سلسلہ میں نازل ہونے والی آیت/آیات، طفیل دوسی کا قصہ قبول اسلام، واقعہ اسراء، ام المومنین حضرت عائشہؓ اور حضرت سودہؓ سے آپؐ کا نکاح کرنا، سفر طائف سے واپسی اور مطعم بن عدی کی جوار، قبائل کو دعوت اسلام، بیعت عقبہ، ابوقیس کا اسلام قبول کرنا، ہجرت صحابہ کرامؓ، آپؐ کی ہجرت اور اس کا سبب، قصہ سراقہ بن مالک، مشروعیت اذان۔

کتاب المغازی: اولین علم اسلام، عبداللہ بن جحش کی امارت، غزوہ ابواء، غزوہ بدر، غزوہ احد، غزوہ خیبر، غزوہ موتہ، فتح مکہ، غزوہ حنین، غزوہ طائف، غزوہ تبوک، قدوم وفود، حجۃ الوداع، سریہ غالب بن عبداللہ لیثی، سریہ زید بن حارث، عامر بن اضبط کا قتل، مرض وفات اور تدفین نبویؐ، آپؐ کے اوصاف کریمہ، نصاریٰ کے نزدیک آپؐ کا ذکر، سالم بن ہبیرہ حضرمی کا قبول اسلام اور ان کا آپؐ کا مرثیہ کہنا اور آپؐ کی عادات و اطوار۔

مرویات مغازی یحییٰ بن سعید اموی کے مذکورہ بالا تمام مباحث اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ نہیں بیان کیے گئے ہیں بلکہ ان مباحث سے متعلق بعض معلومات کا ذکر ان مرویات میں کیا گیا ہے۔

ولید بن مسلم کی کتاب المغازی: ولید بن مسلم دمشقی (۱۱۹-۱۹۵ھ) کا شمار علماء و مصنّفین

مغازی میں ہوتا ہے۔ابن ندیم نے اپنی کتاب الفہرست میں ان کی مولفات میں کتاب المغازی کا ذکر کیا ہے۔ان کی مرویات محمد بن عائذ (۱۵۰-۲۳۳ھ) اور دیگر رواۃ کے واسطے سے سیر و مغازی کی کتب میں پائی جاتی ہیں۔ابن حجرؒ نے بھی ابن عائذ کے واسطے سے فتح الباری میں ولید بن مسلم کی کتاب المغازی کی روایات نقل کی ہیں۔

ابن حجرؒ کے بعض اقوال سے محسوس ہوتا ہے کہ محمد بن عائذ خود بھی مولف سیرت ہیں مثلاً وہ فرماتے ہیں "وجدت فی مغازی ابن عائذ"، لیکن غالب گمان ہے کہ وہ صرف ولید بن مسلم کی کتاب المغازی کے راوی تھے، مولف سیرت نہیں تھے۔

عبداللہ بن وہب کی کتاب المغازی: عبداللہ بن وہب مصری (م ۱۹۷ھ) کا شمار اس عہد کے نامور ان علم و فضل میں ہوتا تھا۔ان کے اساتذہ کی تعداد بہت زیادہ بتائی جاتی ہے۔بقول ذہبی وہ صاحب تصانیف کثیرہ ہیں۔قاضی عیاض کے مطابق انہوں نے کتاب المغازی بھی لکھی تھی جس کے راوی ابراہیم بن منذر حزامی (م ۲۳۶ھ) ہیں۔وہ اس کتاب کا درس بھی دیا کرتے تھے۔

یونس بن بکیر شیبانی کوفی کی کتاب المغازی: یونس بن بکیر شیبانی کوفی (م ۱۹۹ھ) کا شمار ابن اسحاق کے ان اجل تلامذہ میں ہوتا ہے جنہوں نے ان سے براہ راست مغازی کا علم حاصل کیا تھا اور بعد میں قدماء کے طریقہ پر اس میں دوسری روایات کا اتنا اضافہ کیا کہ اسے ایک مستقل کتاب سیرت کی حیثیت حاصل ہوگئی ابن حجر نے ایک مقام پر اس کی تصریح بھی کردی ہے "وفی روایة یونس بن بکیر فی زیادات المغازی" ۔بقول قاضی مبارک پوریؒ "یہ کیا کم دینی و علمی خدمت ہے کہ ابن اسحاق کی کتاب المبتدأ والمبعث والمغازی کا معتدبہ حصہ اصل صورت میں سامنے آگیا ہے اور سیرت ابن ہشام میں جو کمی ہے اس کی بڑی حد تک تلافی ہوگئی ہے۔

یونس بن بکیر شیبانی کوفی کی کتاب المغازی بھی ایک زمانہ تک علمی حلقوں میں متداول رہی ہے۔خلیفہ بن خیاط (م ۲۴۰ھ)، امام طبری (م ۳۱۰ھ) اور ابن حجر وغیرہ نے متعدد مقامات پر اس کا حوالہ دیا ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہؒ نے ان کی کتاب المغازی کو تحقیق و تدوین کے بعد علمی دنیا کے سامنے پیش کردیا ہے لیکن وہ زیاد بکائی سے مروی مغازی ابن اسحاق جیسی شہرت و قبولیت حاصل نہ کرسکی

غالباً جس کی بنیادی وجہ اس کا نامکمل ہونا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ سب سے پہلے نقوش کے رسول نمبر میں شائع ہوا اور کتابی شکل میں ملی پبلی کیشنز، نئی دہلی سے ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کے مترجم نور الٰہی ایڈوکیٹ ہیں۔ بقول قاضی مبارکپوری ''اس میں بیشتر روایات براہ راست ابن اسحاق سے ہیں، اس کے ساتھ دوسرے کئی شیوخ واساتذہ کی روایتیں بھی ہیں جو غالباً کتاب کا چوتھائی حصہ ہیں۔ ہمارے خیال میں یونس بن بکیر کی اس کتاب کو سیرت ابن اسحاق سے تعبیر کرنا ''للأکثر حکم الکل'' کے اعتبار سے صحیح ہوسکتا ہے، ورنہ یہ یونس بن وکیر کی مستقل کتاب ہے جس کو انہوں نے ابن اسحاق کی کتاب المغازی کو اصل قرار دے کر اضافات وزیادات سے مکمل کیا ہے''۔

ان کی کتاب المغازی کے راوی ابوکریب محمد بن علاء ہمدانی (م ۲۴۸ھ) اور احمد بن عبدالجبار عطاردی کوفی (م ۲۷۲ھ) ہیں۔

مشہور ومعروف مفقود مصادر سیرت کے علاوہ مصادر وماٰخذ سے دیگر کتب سیرت کا بھی پتہ چلتا ہے لیکن ان کے بارے میں بہت زیادہ معلومات نہیں ملتی ہیں اور نہ ہی ان کی مرویات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ایسی مفقود کتب سیرت کا ذکر عام طور پر مولف کی دیگر کتب کی فہرست کے ضمن میں ملتا ہے مثلاً ابن ندیم نے اپنی کتاب میں کئی ایک مولفین کی کتب کا ذکر کرتے ہوئے ان کی کتاب سیرت کا بھی ذکر کیا ہے۔ نسبتاً کم مشہور ومعروف مفقود مصادر سیرت کا تذکرہ ذیل کی سطور میں کیا جارہا ہے:

وہب بن منبہ (م ۱۱۰ھ) کی جانب کشف الظنون کے مولف نے ایک کتاب المغازی بھی منسوب کی ہے۔ سیرت ابن ہشام کے محققین، مصطفیٰ السقا، ابراہیم ابیاری اور عبدالحفیظ شلبی کے بقول انہوں نے مغازی پر ایک کتاب لکھی تھی جس کا کچھ حصہ ہیڈلبرگ (جرمنی) میں محفوظ ہے لیکن دیگر مصادر اس ضمن میں بالکل خاموش ہیں۔

ھشیم بن بشیر واسطی (م ۱۸۳ھ) کی کتاب المغازی کا ذکر شمس الدین محمد بن علی داؤدی مصری نے طبقات المفسرین میں کیا ہے۔

ابوالحسن علی بن محمد بصری مدائنی (۱۳۵-۲۲۴ھ) کی کتاب المغازی وکتاب السرایا کا ذکر ابن ندیم نے ''کتبه فی اخبار النبی ﷺ'' کے تحت کیا ہے۔ ان کے علاوہ ابن ندیم نے

سیرت نبویؐ سے متعلق ان کی دیگر کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے جن میں "**کتاب امهات النبی ﷺ ، کتاب صفة النبی ﷺ ، کتاب عهود النبی ﷺ ، کتاب تسمية الذين يوذون النبی ﷺ ، کتاب رسائل النبی ﷺ ، کتاب کتب النبی ﷺ الی الملوک ، کتاب آيات النبی ﷺ ، کتاب اقطاع النبی ﷺ ، کتاب صلح النبی ﷺ ، کتاب خطب النبی ﷺ ، کتاب الوفود : وفود اليمن و مضر و ربيعة ، کتاب دعاء النبی ﷺ ، کتاب ازواج النبی ﷺ ، کتاب عمال النبی ﷺ علی الصدقات ، کتاب ما نهی النبی ﷺ ، کتاب من کتب للنبی ﷺ کتابا او امانا ، کتاب اموال النبی ﷺ و کتابه ومن کان يرد عليه بالصدقة من العرب** شامل ہیں۔

احمد بن محمد بن ایوب وراق بغدادی (م ۲۲۸ھ) نے ابن اسحاق کے شاگرد ابراہیم بن سعد سے سیر و مغازی کا علم حاصل کیا تھا۔ انہوں نے اپنے ہم درس فضل بن یحییٰ برمکی کے لیے ابن اسحاق کی کتاب المغازی کو نقل کیا تھا اور ان کی درخواست پر ابراہیم بن سعد کے پاس جا کر ان کے نسخہ سے تصحیح کی تھی۔

یحییٰ بن معین نے اس بات کا انکار کیا ہے کہ انہوں نے فضل بن یحییٰ برمکی کے ساتھ ابراہیم بن سعد سے ابن اسحاق کی کتاب المغازی پڑھی تھی، ان کی دلیل یہ ہے کہ ابراہیم بن سعد اپنے لڑکوں کے علاوہ کسی کو کتاب المغازی نہیں پڑھاتے تھے۔

ابن حجر نے "**باب قتل ابی جهل**" میں مغازی احمد بن محمد بن ایوب کا حوالہ دیا ہے۔

ابراہیم بن منذر رحزامی (م ۲۳۶ھ) کی کتاب المغازی کا ذکر فضل بن محمد شعرانی بیہقی (م ۲۸۲ھ) کے ضمن میں ملتا ہے کہ ان کے پاس چند ایسی کتابیں تھیں جن کی روایت میں وہ منفرد تھے ان میں ابراہیم بن منذر رحزامی کی کتاب المغازی بھی شامل ہے۔ لیکن غالب گمان ہے کہ انہوں نے کوئی مستقل بالذات کتاب المغازی نہیں لکھی تھی بلکہ وہ عبداللہ بن وہب مصری (م ۱۹۷ھ) کی کتاب المغازی تھی جس کے وہ راوی تھے اور اس کا درس بھی دیا کرتے تھے۔

عبدالملک بن حبیب سلمی اندلسی (م ۲۳۸ھ) کی کتاب المغازی کا ذکر قاضی عیاض

اور شمس الدین محمد بن علی داؤدی مصری نے طبقات المفسرین میں کیا ہے۔

احمد بن حارث بغدادی (م ۲۵۸ھ) کی **کتاب المغازی النبی ﷺ و سرایاہ و ذکر ازواجہ** کا ذکر ابن ندیم نے کیا ہے۔ بقول قاضی مبارکپوریؒ ''غالباً یہ کتاب ابوالحسن مدائنی کی **کتاب المغازی ، کتاب ازواج النبی ﷺ اور کتاب السرایا** کا مجموعہ ہے جن کو احمد بن حارث خزاز نے ان سے روایت کر کے قدماء کے طریقہ پر ان میں اضافہ کیا ہے، اس لیے ان کی طرف منسوب ہوگئی ہے''۔

اسماعیل بن اسحاق جہضمی بصری (۲۰۰-۲۸۲ھ) کی کتاب المغازی کا ذکر ابن ندیم قاضی عیاض اور امام داؤدی نے کیا ہے۔

ابراہیم بن محمد بن سعید ثقفی کوفی (۲۸۳ھ) کی کتاب المغازی کا ذکر شمس الدین محمد بن علی داؤدی مصری نے طبقات المفسرین میں کیا ہے۔

ابراہیم بن اسحاق حربی بغدادی (۲۸۵ھ) کی کتاب المغازی کا ذکر ابن ندیم نے کیا ہے۔

سلمہ بن فضل ابرش انصاری رازی (م ۲۹۱ھ) کا شمار ابن اسحاق کے ناموران شاگردوں میں ہوتا ہے، وہ ان کی کتاب المغازی کے راوی بھی تھے۔ ان کی کتاب المغازی کا ذکر یحییٰ بن معین نے کیا ہے۔ ان کی کتاب کے راوی ابراہیم بن مصعب رازی ہیں۔

محمد بن یحییٰ مروزی بغدادی (۲۹۸ھ) کی کتاب المغازی کا ذکر خطیب بغدادی نے کیا ہے۔

حسین بن محمد ماسرجسی نیشاپوری (م ۳۶۵ھ)؟؟ کی کتاب المغازی کا ذکر امام سمعانی نے کیا ہے۔

عثمان بن عمرو جزری کی کتاب المغازی کا سراغ معمر بن راشد کے اس قول سے ملتا ہے کہ انہوں نے جزری کی کتاب المغازی کے دو جزء نقل کیے تھے اور بعد میں عاریتاً کسی کو دیا تھا لیکن اس نے واپس نہیں کیا۔

خلاصۂ بحث: فن سیرت نگاری کے تطور وارتقاء پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فن سیرت نگاری کے ابتدائی خط وخال احادیث کی روایات کے ضمن میں ظاہر ہوئے تھے کہ محدثین آپؐ سے مروی احادیث کو اپنی اپنی مجالس میں ایک تسلسل کے ساتھ بیان کرتے تھے یا

ان احادیث کو اپنے اپنے صحائف میں جمع کر لیتے تھے اور غالباً ان احادیث میں موضوعاتی تقسیم نہیں پائی جاتی تھی لیکن کچھ عرصہ کے بعد ہی موضوعاتی تقسیم کا پتہ چلتا ہے کہ مسجد نبویؐ میں منعقد درسی دائروں میں احادیث کو موضوعات کے اعتبار سے بیان کیا جانے لگا مثلاً حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حالات زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے حلقہ درس میں ہر روز کسی نہ کسی موضوع سے متعلق روایات بیان کرتے تھے گویا انہوں نے ہر علم سے متعلق احادیث بیان کرنے کا ایک دن مقرر کر رکھا تھا۔ ان کے علاوہ کئی صحابی اور تابعی مسجد نبویؐ میں کتاب المغازی کا درس دیتے تھے جس نے آگے چل کر کتاب کا پیراہن اختیار کرلیا۔

مفقود مصادر سیرت کو چند بنیادی زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، پہلے زمرہ میں وہ کتب ہیں جن کی مرویات مصادر میں بکھری ہوئی ہیں جبکہ دوسرے زمرہ میں وہ کتب سیرت شامل ہوں گی جن کا ذکر ان کے مصنّفین کی دیگر کتب کی فہرست کے ساتھ ملتا ہے اور عام طور سے ان کی مرویات نہیں ملتی ہیں۔

اب تک کی معلومات کے مطابق اولین مولف سیرت حضرت عروہ بن زبیر ہیں۔ ان کے بعد مولفین سیرت کی ایک کہکشاں نظر آتی ہے لیکن دیگر علوم وفنون کی طرح اس فن کی ابتدائی اور بنیادی کتابیں زمانہ کے دست و برد کا شکار ہوگئیں اب ان مولفین سیرت کی خدمات سیرت کا اندازہ صرف ان مرویات سیرت سے ممکن ہے جو دوسری کتابوں میں موجود ہیں۔

یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ حضرت امام زہری اس لحاظ سے سب سے زیادہ منفرد ہیں کہ زیادہ تر مرویات سیرت کا تعلق ان ہی سے ہے متاخرین سیرت نگار مغازی موسیٰ بن عقبہ اور مغازی محمد بن اسحاق سے استفادہ کرتے ہیں اور یہ دونوں مغازی، امام زہری سے مستفاد ہیں۔

ان معلومات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ تدوین سیر و مغازی میں سب سے زیادہ اثرات امام ابن اسحاق کے مرتب ہوئے جنھوں نے سیرت نبویؐ کے مطالعہ کا ایک عہد ساز رجحان پیدا کیا۔ مطاع طرابیشی نے اپنے گراں قدر مقالہ "**رواة المغازی و السیر عن محمد بن اسحاق**"، میں ان کے راویوں کا تفصیلی جائزہ پیش کر کے ان کی تعداد ساٹھ سے زائد بتائی ہے۔

یہ حقیقت بھی منکشف ہوتی ہے کہ اکثر کتب مغازی فرماں روایان وقت کی خواہش و

فرمائش پر مرتب کی گئیں تھیں تاہم بعض کتابوں کا سبب تالیف اور بھی ہے جیسے موسیٰ بن عقبہ نے اپنے معاصر سیرت نگار پر لگنے والے الزامات کو رفع کرنے کے لیے کتاب المغازی مرتب کی تھی۔ اسی طرح بعض نے اپنے علمی ذوق کی تسکین یا سیرت نبویؐ کو محفوظ کرنے کے لیے کتابیں لکھیں جیسے عروہ ابن زبیر، ابن شہاب زہری اور ابان بن عثمان وغیرہ۔

یہ بھی ہوا کہ بعض مولفین نے فرماں روایان وقت کی فرمائش کو خوش اسلوبی سے ٹال دیا تھا جیسے امام زہری سے امیر وقت نے ایک کتاب سیرت مرتب کرنے کی خواہش کا اظہار کیا لیکن انہوں نے فرمائش کی تعمیل سے بہت خوش اسلوبی سے اپنا دامن بچالیا تھا اور بعد میں آزادانہ طور پر ایک کتاب سیرت مرتب کی جسے ام کتب سیرت کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ بعض راویوں کو مولفین کے زمرہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ گو یہ بات اپنی جگہ کہ بعض راویوں نے اپنے استاد کی کتابوں میں اس قدر حذف واضافہ کیا کہ وہ مستقل بالذات تالیف ہوگئیں لیکن یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ کس راوی نے کتنا اضافہ کیا اور اس کی قدر و قیمت کیا ہے لہٰذا میری ناقص رائے کے مطابق صرف ان کتابوں کو مستقل بالذات کتب سیرت قرار دینا چاہیے حذف واضافہ کی وجہ سے جن کی ماہیت ہی تبدیل ہوگئی ورنہ ان راویوں کو طبقہ رواۃ میں ہی رکھنا مناسب ہوگا کیونکہ متقدمین بسا اوقات اصل مصنف کے بجائے راوی کے ذکر پر ہی اکتفا کرلیا کرتے تھے جس سے یہ شبہ ہوتا کہ وہ مستقل سیرت نگار تھے۔

یہاں یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ جب ہمارے پاس نہ اصل مولف سیرت کی کتاب موجود ہے اور نہ ہی اس کے اس راوی کی کتاب جس کی طرف وہ منسوب کی جارہی ہے تو ان کے درمیان موازنہ و مقارنہ کس طرح کیا جاسکتا ہے۔ یہ سوال معقول اور مناسب ہے۔ لیکن اس کا کوئی حتمی جواب نہیں دیا جاسکتا ہے، البتہ مصادر میں موجود مرویات کے درمیان موازنہ و مقارنہ سے فیصلہ کرنا ممکن ہے اور آسان ہے۔

کاش مفقودہ مصادر سیرت کی بکھری ہوئی روایات کو مصنّفین کے اعتبار سے مرتب کردیا جائے تاکہ کل نہ سہی تو یہ بکھرے موتی جمع ہوکر ایسے گوشوں کو روشن کرسکیں جو اب تک نظر سے مخفی ہیں۔

ڈاکٹر عارف نوشاہی کی تازہ ترین علمی تصانیف

ڈاکٹر سید حسن عباس

پاکستان کے پروفیسر ڈاکٹر عارف نوشاہی (پ: ۱۹۵۵ء) کا شمار عصر حاضر کے ان محققین میں ہوتا ہے جنہیں بجا طور پر ''فنا فی العلم'' قرار دیا جاسکتا ہے۔ جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ تحقیق اور علم و ادب کے لیے وقف ہے۔ اگرچہ وہ ۱۹۹۸ء سے گورڈن کالج راول پنڈی میں بحیثیت پروفیسر اور صدر شعبہ فارسی تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں، لیکن اس سے بہت پہلے وہ اپنے علمی کاموں کی بدولت دنیائے علم و ادب میں بحیثیت فہرست نویس، مخطوط شناس اور کتاب شناس اپنا مقام بنا چکے تھے۔ گورڈن کالج سے منسلک ہونے سے قبل وہ مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد کے شعبہ تحقیقات کے سربراہ اور معاون لائبریرین، مجلّہ ''دانش''، اسلام آباد کے بانی مدیر، مجلّہ کتاب شناسی کے مدیر، بنیاد دائرۃ المعارف اسلامی تہران، مرکز دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی تہران اور فرہنگستان زبان و ادب فارسی تہران کے مشاور رہ چکے ہیں۔ وہ خود اسلام آباد میں ایک ذاتی کتب خانے کے مالک بھی ہیں جس میں مطبوعات و مخطوطات اور حوالے کی گراں قدر کتب موجود ہیں اور سب سے عمدہ بات یہ ہے کہ اہل علم کے لیے نہ صرف ان کے کتاب خانے کا در کھلا رہتا ہے بلکہ وہ خود بھی ہمہ تن علمی تعاون کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں اور اگر اس کام میں ان کا قیمتی وقت یا سرمایہ صرف ہوتا ہے تو انہیں اس سے بھی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنے علمی سفر کا آغاز ایران کے نامور مخطوطہ شناس اور فہرست نویس استاد احمد منزوی کے ساتھ پاکستان میں مخطوطات کی فہرست نویسی کے دوران کیا تھا اور ''فہرست مشترک نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان'' کی ترتیب و تدوین میں احمد منزوی کے معاون رہے تھے۔ مذکورہ

صدر شعبہ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی۔

فہرست کی ۱۳ جلدوں کی اسلام آباد میں اشاعت کے بعد احمد منزوی ایران چلے گئے تو چودھویں جلد کا احمد منزوی کا چھوڑا ہوا مسودہ نوشاہی صاحب نے اضافات اور نظر ثانی کے ساتھ مرتب کر کے شائع کروایا۔

محض علم کتابیات اور فہارس کی تالیف و تدوین کے زمرے میں ۱۹۸۳ء تا ۲۰۱۰ء عارف نوشاہی کے علمی سفر کی روداد اس طرح ہے:

۱-فہرست نسخہ ہای خطی فارسی موزۂ ملی پاکستان کراچی، ۱۹۸۳ء۔۲-فہرست نسخہ ہای خطی فارسی انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، ۱۹۸۴ء۔۳-فہرست چاپ ہای آثار سعدی در شبہ قارہ، ۱۹۸۴ء۔۴-فہرست کتاب ہای فارسی چاپ سنگی و کمیاب کتاب خانہ گنج بخش اسلام آباد (۲ جلدیں)، ۱۹۸۶ء-۱۹۸۹ء۔۵-فہرست مخطوطات اردو کتاب خانہ گنج بخش اسلام آباد، ۱۹۸۸ء۔۶-بھارت میں مخطوطات کی فہرستیں (کتابیات)، لاہور، ۱۹۸۸ء۔۷-پاکستان میں مخطوطات کی فہرستیں (کتابیات)، لاہور، ۱۹۸۸ء۔۸-فہرست مخطوطات کتاب خانہ نوشاہیہ، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء۔ ۹-ایران اور افغانستان میں مخطوطات کی فہرستیں، لاہور ۱۹۹۳ء۔۱۰-فہرست مخطوطات کتب خانہ وحید قریشی، لاہور، ۱۹۹۳ء۔۱۱-فہرست مشترک نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان، اسلام آباد (جلد چہاردہم، ترتیب)، ۱۹۹۷ء۔۱۲-فہرست نسخہ ہای خطی فارسی کتاب خانہ گنج بخش، اسلام آباد (جلد پنجم، ترتیب)، ۲۰۰۵ء۔۱۳-فہرست مخطوطات آزاد، ذخیرۂ محمد حسین آزاد، جامعہ پنجاب، لاہور، ۲۰۱۰ء۔

سال ۲۰۱۲ء ڈاکٹر عارف نوشاہی کے لیے ایک خاص سال رہا ہے۔اس سال نہ صرف ان کی اپنی تصنیف، ترجمہ اور تدوین کردہ چھ کتب شائع ہوئیں، بلکہ ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر ان کی خدمت میں اہل ایران نے ایک جشن نامہ بھی پیش کیا اور اس سلسلے میں ان کے لیے تہران میں ایک بین الاقوامی مجلس تحسین و تجلیل کا انعقاد بھی ہوا۔۲۰۱۲ء میں پروفیسر نوشاہی کی فتوحات کا ایک مجمل تذکرہ حسب ذیل ہے:

۱-جامی: تصنیف علی اصغر حکمت، اردو ترجمہ و تکملہ عارف نوشاہی، ناشر: مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد اور الفتح پبلی کیشنز، راول پنڈی، ۴۹۲ صفحات۔

مولانا عبدالرحمٰن جامی پر ہندوستان میں ایرانی سفیر، علی اصغر حکمت مرحوم کی معروف

زمانہ تحقیق کو ڈاکٹر نوشاہی نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ پہلی بار یہ ترجمہ ۱۹۸۳ء میں اسلام آباد ر لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اب نوشاہی صاحب نے اس پر مزید اضافات کیے ہیں اور نیا مقدمہ لکھا ہے۔ ان کے لکھے تکملے میں جامی کی ان تصانیف کا ذکر ہوا ہے جو حکمت مرحوم سے نظرانداز ہوگئی تھیں۔ مقدمے میں جامی کے حوالے سے دنیا بھر میں اب تک جو تصنیفی کام ہوا ہے اس کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بالخصوص برصغیر میں جامی کی تصانیف کی مقبولیت کے جو جو پہلو ہیں، ان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۲- یار آشنا (فارسی): تصنیف خلیل اللہ خلیلی، ترتیب و تعلیقات عارف نوشاہی، ناشر: مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد اور الفتح پبلی کیشنز، راول پنڈی، ۱۵۰ صفحات۔

علامہ محمد اقبال اور افغانستان کی قدیم و جدید شخصیات (علی بن عثمان ہجویری، مولانا جلال الدین بلخی، سنائی غزنوی، جمال الدین افغانی) اور اقبال کے ممدوح افغان بادشاہوں کے تعلق کے حوالے سے خوبصورت نثر سے مزین کتاب ہے جسے معروف افغان شاعر، ادیب اور سفارت کار خلیل اللہ خلیلی مرحوم نے اپنے قیام پاکستان کے دوران لکھا تھا۔ مرتب نے آخر میں استاد خلیلی کا وہ کام بھی یکجا کر دیا ہے جو اقبال اور ملت پاکستان کے بارے میں متفرق مجموعہ ہائے کلام میں پایا جاتا ہے۔

۳- کتاب شناسی آثار فارسی در شبہ قارہ (ہند، پاکستان، بنگلہ دیش): از ۱۱۶۰-۱۳۸۶ش/ ۱۱۹۵-۱۴۲۸ق/۱۷۸۱-۲۰۰۷ء، ناشر: میراث مکتوب، تہران ۲۰۱۲ء، ۴ جلدیں، ۳۰۱۵ صفحات۔

یہ برصغیر میں فارسی مطبوعات کی مفصل فہرست ہے جسے جدید طرز فہرست نویسی کے مطابق تیار کیا گیا ہے۔ مصنف ۱۹۷۸ء سے یہ کام تن تنہا انجام دے رہے تھے۔ کتاب کی ترتیب موضوعی اور ہر موضوع کے اندر الف بائی یا ہجائی ترتیب ہے۔ اسے ۱۶ بڑے موضوعات کے علاوہ متعدد ذیلی موضوعات پر ترتیب دیا گیا ہے۔ ہر کتاب کا تعارف دو حصوں میں کرایا گیا ہے۔ پہلے حصے میں مذکور کتاب اور اس کے مصنف اور تاریخ تصنیف وغیرہ کا تعارف اور دوسرے حصے میں اس کی طباعت و اشاعت کے اعتبار سے بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب پہلی بار کب شائع ہوئی تھی اور اب تک کتنی بار چھپ چکی ہے۔ ان چار جلدوں میں ۱۷۸۱ء سے ۲۰۰۷ء تک ہندوستان، پاکستان،

بنگلہ دیش میں چھپنے والی ۱۰۵۸۹ کتب اور ان کی ۲۰۶۲۸ اشاعتوں کا ذکر آیا ہے۔ برصغیر کی پہلی مطبوعہ کتاب انشائے ہرکرن ہے جو ۱۷۸۱ء میں کلکتہ سے طبع ہوئی تھی۔ اس کتابیات کا مطالعہ اس لحاظ سے بھی مفید ہے کہ برصغیر میں علوم و فنون کی تاریخ کی تدوین میں اس سے بڑا تعاون مل سکتا ہے۔ بے شمار گمنام مصنّفین و مولفین کا سراغ مل سکتا ہے۔ ان کے آثار مطبوعہ کی تفصیل دستیاب ہوسکتی ہے۔ واضح ہو کہ ہمسایہ ممالک افغانستان، ایران و وسطیٰ ایشیا میں جب چھاپے خانے کا رواج نہیں تھا تو وہاں کی کتابیں لاہور اور ہندو پاک کے دیگر شہروں میں چھپتی تھیں۔ افغان مہاجرین کی پاکستان میں سکونت کے دوران ان کی تالیف کردہ بے شمار کتابوں کا ذکر بھی اس کتاب شناسی میں ملتا ہے جو پاکستان میں طبع ہوئی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ افغانستان کی معاصر ادبی تاریخ کا بھی ایک اہم ماخذ ہے۔

برصغیر میں فارسی مطبوعات کی اپنی نوعیت کی اس اولین، جامع اور مستند فہرست کو ڈاکٹر معین الدین عقیل (استاد، کراچی یونیورسٹی) کے نہایت عالمانہ اور محققانہ مقدمے کے ساتھ شائع کیا گیا ہے، جس میں اسلامی ممالک خصوصاً برصغیر میں مطبع اور فہرست نویسی کی تاریخ پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

۴-فہرست نسخہ ہای خطی کتاب خانہ مرکزی دانشگاہ پنجاب لاہور: ناشر: میراث مکتوب، تہران ۲۰۱۲ء، ۲ جلد، ۱۳۹۷ صفحات۔

پنجاب یونیورسٹی، لاہور کا مرکزی کتب خانہ پاکستان کا سب سے بڑا اور قدیم ذخیرۂ مخطوطات ہے لیکن بدقسمتی سے گذشتہ اسّی نوے سال سے اس کے بعض ذخائر کے مخطوطات کی مکمل فہرست ابھی تک کسی نے تیار نہیں کی تھی۔ عارف نوشاہی صاحب نے ہمت کی اور یونیورسٹی کے ذخائر شمس العلماء محمد حسین آزاد، پیرزادہ محمد حسین عارف، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی اور جنرل کلیکشن کے فارسی مخطوطات کی مکمل اور حافظ محمود شیرانی کے بعض اہم فارسی مخطوطات کی فہرست تیار کی۔ اس میں چار ہزار سے زائد مخطوطات کا تعارف درج ہوا ہے۔ فہرست موضوعی ترتیب پر لکھی گئی ہے۔ آخر میں مفید اشاریے لگائے گئے ہیں۔

۵-فہرست نسخہ ہای خطی فارسی آرشیو ملی پاکستان اسلام آباد (گنجینہ مفتی فضل عظیم بھیروی): ناشر: میراث مکتوب، تہران ۲۰۱۲ء، ۹۶۷ صفحات۔

پنجاب پاکستان کا ایک تاریخی قصبہ بھیرہ ہے۔ وہاں قریشی عثمانی خاندان قدیم دور سے بس رہا ہے۔ قضا اور تصنیف و تالیف کی روایت اس خاندان میں چلی آرہی ہے۔ گذشتہ صدی میں اس خاندان کے ایک ذی علم شخص مفتی فضل عظیم عثمانی (وفات: ۱۹۴۹ء) کو قلمی اور مطبوعہ کتب جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ کچھ تو اپنا آبائی ذخیرہ مخطوطات اور اس پر خود جو ایزاد کیا، وہ کوئی دو ہزار عربی، فارسی، پنجابی قلمی کتب بن گئیں۔ مفتی صاحب کی وفات سے پچاس سال بعد ان کے خلاف نے ۱۹۹۸ء میں یہ ذخیرہ نیشنل آرکائیوز آف پاکستان، اسلام آباد کو عطیہ کر دیا۔ اس میں کوئی ۱۶۰۰ فارسی مخطوطات کی مفصل فہرست نوشاہی صاحب نے بنادی ہے۔ مقدمہ میں اس خاندان کی علمی خدمات کا تذکرہ کیا ہے اور ضمیمہ میں اس خاندان کے حالات پر ایک پرانا فارسی رسالہ بھی شائع کر دیا ہے۔

۶- سیہ بر سفید (مجموعہ گفتار ہا و یادداشت ہا در زمینہ کتاب شناسی و نسخہ شناسی): ناشر: میراث مکتوب، تہران ۲۰۱۲ء، ۵۹۰ صفحات۔

یہ کتاب عارف نوشاہی کی علمی، ادبی ثقافتی یادداشتوں اور کتاب شناسی نیز مخطوطہ شناسی کے بارے میں ان کے مشاہدات کا مجموعہ ہے جو پانچ حصوں میں منقسم ہے:

۱- کتابیات و فہارس، اس میں چند قدیم کتابیات؛ فہارس مخطوطات، پاکستان، ہندوستان، افغانستان، ایران اور ترکی کے مخطوطات کا ذکر ہے۔ ۲- قلمی کتب پر مفصل تحریریں۔ ۳- مخطوطات سے متعلق یادداشتیں، نکات۔ ۴- مالکان مخطوطہ، مخطوطہ شناسوں اور خوش نویسوں سے مولف کی ملاقاتوں کا احوال۔ ۵- مولف کے نام ایرانی مخطوطہ شناسوں احمد منزوی، ایرج افشار، محمد تقی دانش پژوہ، احمد طاہری عراقی کے خطوط۔

مولف فہرست نویسی و مخطوطہ شناسی نیز کتاب شناسی کا طویل تجربہ رکھتے ہیں اور اب تک مخطوطات اور مطبوعات کی کئی جلدیں ان کی محنت شاقہ کی بدولت منظر عام پر آچکی ہیں۔ یادداشتوں کا یہ انوکھا اور منفرد مجموعہ اہل ذوق کو ادبی انبساط فراہم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے بلکہ محققین کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہاں ایک اور کتاب کا ذکر بے محل نہیں ہے۔ جو اگرچہ ڈاکٹر نوشاہی صاحب کی تصنیف تو نہیں ہے لیکن ان سے متعلق ضرور ہے۔

نذر عارف (جشن نامۂ دکتر عارف نوشاہی): ناشر کتاب خانہ، موزہ ومرکز اسناد مجلس شورائے اسلامی، تہران، ۲۰۱۲ء، ۴۷۴ صفحات۔

عارف نوشاہی کی علمی ادبی شخصیت اور فارسی ادب اور ایران شناسی کے لیے ان کی بیش بہا علمی خدمات کے اعتراف میں ان کے ایرانی قدر دانوں اور دوستوں نے یہ ''نذر'' گذرانی ہے۔ نذر عارف کے نام سے فارسی میں اس ارمغان علمی کو بہروز ایمانی اور ڈاکٹر سعید شفیعیون استاد اصفہان یونیورسٹی نے مرتب کیا ہے۔نوشاہی صاحب جیسے علم دوست اور فنا فی العلم شخص کے لیے ایسے خوبصورت اور ذی قیمت ارمغان علمی کی اشاعت، وہ بھی ایران میں، ہم سب کے لیے یعنی برصغیر کے علمی ادبی حلقے کے لیے نہایت خوش گوار اور باعث فخر ہے جس کے لیے ہمیں ارباب حل و عقد کتاب خانہ مجلس اور وہاں کے علمی حلقے کا شکر گدار ہونا چاہیے۔ساتھ ہی یہاں شرمندگی کا احساس بھی ہے کہ یہ کام ہمیں کرنا چاہیے تھا یا کم از کم برصغیر میں نوشاہی صاحب کے قریبی دوست اپنے مقالات کے ذریعے اس ''نذر'' میں حصہ لیتے۔نذر عارف کی فہرست مقالات میں ہمیں ایک پاکستانی، ایک ہندوستانی اور ایک افغانی مقالہ نگار کا نام نظر آتا ہے باقی تمام مقالات ایرانیوں کے لکھے ہوئے ہیں۔برصغیر کے کسی فارسی محقق کو بذریعہ ارمغان علمی خراج تحسین پیش کرنے کی یہ پہلی ایرانی کوشش ہے۔نذر عارف میں شامل مقالات کی فہرست درج ذیل ہے:

مقالہ نگار	عنوان مقالہ
۱-ڈاکٹر عصمت درانی	زندگی وکارنامۂ دکتر عارف نوشاہی۔
۲-ایرج افشار	دو یادداشت بر دو اثر۔
۳-بہروز ایمانی	لطایفی از سفینۂ فطرت۔
۴-جویا جہان بخش	روایت فصیح الملک از آثار افصح المتکلمین۔
۵-نجاتی نیشاپوری/مسعود راستی پور	الکافیہ فی العروض والصنعۃ والقافیہ۔
۶-محمد کاظم رحمتی	سکینۃ الصالحین تالیف سعدالدین حموی۔
۷-مہدی رحیم پور	اشعار نویافتہ طیان بمی۔
۸-دکتر اسداللہ شعور	مفرح القلوب۔

۹-دکتر سعید شفیعیون — عرفات العاشقین، تذکرہ ای ممتاز۔

۱۰-علی صفری آق قلعہ — جنگ ذیلو باف۔

۱۱-حمید رضا قلیچ خانی — رسالہ خوش نویسی محمد امین۔

۱۲-دکتر شریف حسین قاسمی — مختصر لطیف، مآخذی ارزشمند در تاریخ ہند۔

۱۳- باسنت لوبی رابینودی بورگو مالہ /

ترجمہ: سید محمد حسین مرعشی — نگاہی بہ مہرہای ایرانی از قراقویونلوہا تا پہلوی

۱۴-سید عبدالرضا موسوی طبری — درنگی بر غزلی منسوب بہ قتیل لاہوری۔

بزرگ داشت ڈاکٹر عارف نوشاہی: نذر عارف، عارف نوشاہی صاحب کو پیش کرنے اور مرکز پژوہشی میراث مکتوب، تہران کی طرف سے عارف نوشاہی صاحب کی تازہ مطبوعات، جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، کی رونمائی کے لیے مرکز پژوہشی میراث مکتوب نے ایران کے دیگر علمی اداروں کتاب خانہ ملی ایران، فرہنگستان زبان وادبن فارسی، سازمان فرہنگ وارتباطات اسلامی اور کتاب خانہ مجلس شورای اسلامی کے تعاون سے ۱۱ر جولائی ۲۰۱۲ء کو تہران میں ایک روزہ بین الاقوامی سمینار ''برصغیر میں فارسی مطبوعات ومخطوطات'' منعقد کیا۔ جس میں ہندوستان، پاکستان، ترکی، بلغاریہ اور ایران سے مندوبین شریک ہوئے اور ڈاکٹر نوشاہی کی علمی خدمات پر مقالات پڑھے۔ آخر میں ان تمام اداروں نے ایرانی وزیر ثقافت کی موجودگی میں نوشاہی صاحب کو تعریفی اسناد پیش کیں۔ یقیناً یہ فریضہ ان کے ہم وطن سرکردگان علم وادب کو اپنے مایۂ افتخار کے لیے انجام دینا چاہیے تھا، لیکن یہ توفیق بھی اہل ایران کو حاصل ہوئی۔ بلاشبہ وہ عزت واعزاز اور پذیرائی جو عارف نوشاہی کا نصیب بنی، معدودے چند لوگوں کے حصے میں ہی آتی ہے۔

آخر میں ہم ڈاکٹر عارف نوشاہی کی ان علمی فتوحات پر بجا طور پر نازاں ہوتے ہوئے ان کی صحت وسلامتی اور طول عمر کی دعا وآرزو کے ساتھ یہی امید کرتے ہیں کہ وہ اپنی رفتار علمی اسی طرح برقرار رکھیں اور اس راہ میں مزید کامیابیاں حاصل کریں گے۔ آمین۔

علامہ شبلیؒ کی ایک ناتمام نظم

سید حسن رضا عارف ہاشمی

علامہ شبلی نعمانیؒ کے کلام کا مجموعہ ''کلیات شبلی اردو و فارسی'' کے نام سے ان کے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندویؒ نے نہایت عرق ریزی سے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔قبولیت عام نے اب تک اس کے متعدد ایڈیشن شائع کرائے ، مرتب نے جمع و ترتیب کے جو اصول پیش نظر رکھے تھے مقدمہ میں مختصراً ان کا تذکرہ ہے، کہیں طویل اور کہیں مختصر مگر بے حد مفید، حواشی ایسے ہیں جو اگر نہ ہوتے تو پس منظر کا پتہ لگانے کے لیے قاری کو خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا، کلیات شبلی کے صفحہ ۱۱۶ پر درج ذیل نظم ہے:

۱- اک شہر میں کہ پایۂ تخت قدیم ہے پچھلے پہر سے آج عجب شور و شین ہے
۲- پرچم ہے، بیرقیں ہیں، علم ہیں، نشان ہیں غل ہے کہ آج عیش ہے راحت ہے چین ہے
۳- مسند نشیں ہے تخت حکومت پہ جلوہ گر دربار ہے کہ جلوہ گہِ زیب و زین ہے
۴- ہیں بے نقاب پردگیان حریم قدس جن کی زبان پہ شور ہے نوحہ ہے بین ہے
۵- تاکید ان پہ ہے کہ ادب سے کھڑی رہیں یعنی کہ احترام شہی فرض عین ہے

اس نظم کی پیشانی پر سید صاحب کی یہ تحریر ملاحظہ ہو:

''معلوم نہیں ان اشعار میں کن واقعات کی جانب اشارہ کیا ہے''۔

سید صاحب کا یہ نوٹ ہی میری اس تحریر کا سبب ہے۔میرے خیال میں نظم کے طرز و انداز سے پوری طرح واضح ہے کہ ان اشعار میں واقعات کربلا کی جانب نشان دہی کی گئی ہے، ان اشعار سے اس عظیم سانحہ کی ایک ایک پرت کھلتی جاتی ہے، ہر شعر کی الگ الگ تشریح اسی لیے

محلّہ سیتارام، اعظم گڑھ۔

پیش خدمت ہے کہ بات واضح ہوجائے:

۱- پہلے شعر میں شاعر قاری کے ذہن میں ایک شہر کا منظر ابھارتا ہے جو ازمنۂ قدیم سے صدر مقام ہوتا چلا آرہا ہے جہاں ملک کا سربراہ ہے، مفتوحہ ممالک سے مال غنیمت اور قیدی برابر آتے رہتے ہیں، بقیۃ السیف مجرمین، لونڈی غلاموں کا لایا جانا معمولات سے ہے، ایسے شہر میں آج عجب شور وشین بپا ہے، فاتح عسکریوں کے مسرت آمیز نعروں میں قیدیوں کی آہ وبکا سے منظر پرشور بھی ہے اور پرسوز بھی۔

۲-لشکریوں میں بہت سے منصب دار ہیں جو حسب مرتبت شناختی نشان لیے ہوئے ہیں، کوئی پرچم سنبھالے ہے، کتنوں کے ہاتھ میں بیرقیں ہیں، ہر نشان، ہر علم سے منصب داروں کی کثرت ظاہر ہوتی ہے یعنی کسی بڑے غنیم سے مقابلہ تھا جس پر فتح حاصل کرلی گئی ہے، اس زبردست حریف کی شکست پر اب عیش ہے، کثرت وقلت کا یہ منظر نگاہوں کے لیے حیرت انگیز ہے۔

دو شعروں کو ملا کر شاعر نے ایک محاکات پیش کی ہے لفظ ''عجب'' کے انتخاب سے ان قیدیوں کو عام قیدیوں سے امتیازی صف میں لا رکھا ہے، یہ معمولی قیدی معلوم نہیں ہوتے، شاعر نے فنکاری اور چابک دستی سے جو منظر پیش کرنا چاہا اس میں کامیاب ہوا۔

عربی زبان میں حیرت واستعجاب کے موقع پر ''عجب'' بولا جاتا ہے، اس لفظ عجب سے شاعر نے منظر کشی میں پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے اور قاری کے ذہن کو تحیر، جستجو کی انتہائی حد تک پہنچا دیا۔

تیسرے شعر میں دربار کا نقشہ ہے، یہ دربار اس شہر میں ہے جو ازمنۂ قدیم سے پایۂ تخت چلا آرہا ہے، اس فتح عظیم کے موقع پر خوب آراستہ پیراستہ ہے، عمائد، اکابر، فوجی منصب دار، حسب حیثیت اپنی اپنی نشستوں پر اور حاکم وقت بصد شان وشوکت وکروفر تخت حکومت پر جلوہ افروز ہیں، قیدی حاضر کیے جاتے ہیں، ان قیدیوں میں عورتیں اور بچے ہیں، کچھ خواتین بے مقنع وچادر، ننگے سر، ننگے پیر ہیں، ایک مرد بیمار ہے۔

اب تک شاعر پوری فطانت وفن کاری سے قاری کے ذہن کو جس منزل تک لا چکا ہے وہ تجسس کا آخری درجہ ہے اس کے بعد راز کو کھلنا ہی ہے اور آخر پردہ اٹھتا ہے

ہیں بے نقاب پردگیان حریم قدس جن کی زبان پہ شور ہے نوحہ ہے بین ہے

اس لفظ حریم قدس نے سارا تحیر و تجسس ختم کر دیا، ذہن فوراً اصل صورت حال کی جانب منتقل ہو جاتا ہے، یہ عفت و عصمت سرا کی شہزادیاں اہل بیت رسول پاک ﷺ ہیں، نبی اکرم ﷺ کا گھرانہ ہے جس میں نبی کی نواسیاں فاطمہ زہرا کی بیٹیاں، زینب وکلثوم ہیں، جن کے لبوں پہ نوحہ و بین ہے، بیڑی میں جکڑے علی ابن الحسین ہیں جو ماں بہنوں کو لیے شرم و حیا سے سرنہوڑائے کھڑے ہیں، شاعر کی حساس طبیعت اسی واقعہ سے متاثر ہوئی کہ یہ نظم ہوگئی۔

تیسرا اور چوتھا شعر مل کر جو محاکات تیار کرتا ہے ایک غیرت دار مسلمان کا دل غم سے خون ہو جاتا ہے، اب پانچواں اور آخری شعر طاق ہے، یہ شعر اگرچہ منفرد ہے لیکن یہی شعر اس غمناک کہانی کی جان اور ماحصل ہے

تاکید ان پہ ہے کہ ادب سے کھڑی رہیں
یعنی کہ احترام شہی فرض عین ہے

چار اشعار کے ساتھ یہ پانچواں منفرد اور آخری شعر چاروں شعروں کو مربوط کر کے کہانی تمام کرتا ہے، کیا اب بھی نظم ناتمام رہ گئی۔

ایک بات اور قابل توجہ ہے کہ علامہ شبلیؒ کی نظموں کا بالعموم یہی انداز ہے اور یہی انداز بیان ان کی انفرادیت ہے کہ آخر آخر میں ایک دو اشعار ایسے ہوتے ہیں جس میں عبرت، نصیحت، ہدایت اور ایک پیغام ہوتا ہے، جو نظم کا ماحصل ہوتا ہے مثلاً نظم جرأت وصداقت میں دور منصور کا ایک سیاسی واقعہ بیان کیا ہے، سادات عظام قیدی سے اس کے رہوار کے ساتھ پیدل چل رہے ہیں، نظم کے اختتام پر علامہ شبلیؒ فرماتے ہیں:

ایک نے مجمع سادات سے بڑھ کر یہ کہا گرچہ اس لطف کے مشکور ہیں ہم خاک نشیں
غزوۂ بدر میں لیکن جو کیا ہم نے سلوک وہ تو کچھ اور تھا ہے یاد بھی تم کو کہ نہیں

غزوۂ بدر میں حضرت عباسؓ کفار مکہ کے ساتھ گرفتار ہوئے تھے جن کی مشکیں کسی گئی تھیں، رسول اللہ ﷺ کو رات نیند نہیں آئی تھی، آپؐ نے مشکیں کھلوائیں، تب آرام پایا۔ دور اموی میں جب خلیفہ عبدالملک نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ پر فتح پائی، شامی فوج کے سالار حجاج نے حضرت زبیرؓ کی لاش کو سولی پر لٹکا دیا، جب حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی والدہ اسماءؓ کا ادھر سے گذر ہوا تو

ان کی زبان سے عزیمت کے جو الفاظ نکلے، وہ علامہ شبلی نے اس طرح ادا کیے

اب بھی منبر پہ کھڑا ہے یہ خطیب اب بھی گھوڑے سے نہ اترا یہ سوار

ہوچکی دیر کہ منبر پہ کھڑا ہے یہ خطیب اپنے مرکب سے اترتا نہیں اب بھی یہ سوار

یہ اور اس قسم کی بیسیوں مثالیں ''کلیات شبلی'' سے پیش کی جاسکتی ہیں۔

جامع کلیات مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی دیانت وامانت اور ان کے ادبی ذوق و عظمت کا ہم کو پورا اعتراف ہے، انہوں نے استاد مکرم کے نگارشات شعری کی جمع وترتیب میں جس جستجو، محنت اور ایمان داری کا مظاہرہ کیا ہے وہ فقید المثال ہے، جو شعر جہاں ملا، جتنا ملا، جیسا ملا اسے نذر قرطاس کر دیا خواہ ایک مصرعہ ہی کیوں نہ ہو رائیگاں نہیں کیا، دور اول کی غزل کا ایک مصرعہ دستیاب ہوا وہی لکھ دیا (۱)............ اب جو تشریف صبا لائی ہے تو کیا لائی ہے

یہ تیسرے شعر کا مصرعہ ہے دو شعر مکمل ہیں کلیات کے صفحہ ۱۱۳ پر متفرقات کے عنوان سے سیرت پر تین قطعے ہیں، دو مکمل ہیں ایک وہی ہے جو علامہ کی لوح قبر کی زینت ہے۔

دوسرا قطعہ فرشتوں میں یہ چرچا ہے کہ حال سرور عالمؐ والا ہے۔

تیسرے قطعہ کا ایک مصرعہ ملا، وہی لکھ دیا، نوٹ لگا دیا کہ یہ ''زمیندار'' یا ''ہمدرد'' میں چھپا تھا، جامع اوراق کو صرف آخری مصرعہ یاد ہے کہ فرشتے میرے ہاتھوں سے ٹنی لیتے جاتے ہیں۔

نظم ناتمام کے عنوان سے جب راقم نے زیر بحث اشعار پڑھے تو سید صاحبؒ کا یہ نوٹ پڑھ کر حیرت ہوئی کہ جس نظم کو پڑھ کر تاریخ اسلام کے معمولی طالب علم کا ذہن فوراً واقعات کربلا کی جانب منتقل ہوتا ہے، سید صاحبؒ جیسے محقق، مورخ اور بے نظیر ادیب نے یہ کیوں کر لکھ دیا کہ ''معلوم نہیں ان اشعار میں کن واقعات کی جانب اشارہ ہے''۔

اخبار علمیہ

''بینائی و گویائی سے محروموں کے لیے قرآن''

الجزیرہ کی خبر کے مطابق فلسطین کی وزارت امور مذہبی کے تعاون سے چلنے والے ادارہ تعلیم القرآن نے گونگے، بہرے افراد کے لیے ایسا قرآن تیار کیا ہے جس کو اشاروں کی مدد سے پڑھا اور اس کے مفہوم و معنی کو سمجھا جاسکتا ہے، اس کے اندر آواز، تفہیم کی سہولت اور حروف کے توضیحی اور تحریری نقشے بھی موجود ہیں جو قاری کو تینوں طریقوں سے سمجھنے میں معاون ہیں، یہ پندرہ سی ڈیز پر مشتمل ہے، اس کی تیاری میں غزہ کے پیدائشی بہرے شخص عبدالرحمٰن کا اہم حصہ ہے، ان کا کہنا ہے کہ بہرے افراد تلاوت قرآن کی سعادت ہی سے نہیں بلکہ اس کی تعلیمات اور دین کے بیشتر مسائل سے بے خبر زندگی گذار دیتے ہیں، اس منفرد نسخہ قرآن سے ان کے لیے بھی فہم تلاوت وفہم قرآن کی راہ ہموار ہوگی، رپورٹ کے مطابق یہ نسخہ اردن کی وزارت اوقاف کی زیرنگرانی پانچ برس کی مسلسل محنت شاقہ کے بعد تیار کیا گیا ہے، قطر کے شیخ عید بن محمد آل ثانی فاؤنڈیشن نے اس کی مالی اعانت کی ہے اور یہ غزہ میں گونگے بہروں کے لیے قائم اسکولوں میں تقسیم کیا جارہا ہے، ایک نسخہ کا ہدیہ دوسو ڈالر ہے جس کو قطری فاؤنڈیشن نے ادا کیا ہے، تعلیم القرآن نے آیندہ چار برس میں پورے عرب ممالک میں ایسے سماعت و گویائی سے محروم لوگوں کے لیے اس نسخے کی فراہمی کا منصوبہ بنایا ہے۔

''جریدہ ٹائیٹینک کا اسلام ایڈیشن''

ٹائیٹینک طنزیہ مواد پر مشتمل جرمن کا معروف جریدہ ہے، اکتوبر کے سرورق پر ایک باریش شخص کو ایک ہاتھ میں لہراتے خنجر اور دوسرے میں سابق جرمن صدر کرسٹینا ن وولف کی اہلیہ بیٹینا وولف کو تھامے دکھایا گیا ہے جس کے نیچے درج عبارت سے یہ تاثر ظاہر ہورہا ہے کہ وہ آنحضورؐ سے متعلق بننے والی فلم میں اداکاری کررہی ہیں، اس کی بابت جب ایڈیٹر لیوفشر سے کہا گیا کہ اس سے مغربی ملکوں کے خلاف جاری ہنگاموں میں اضافہ ہی ہوگا تو اس نے کہا کہ میں نے قرآن کو خود متعدد بار بغور پڑھا ہے، اس میں کوئی ایک عبارت بھی ایسی نظر نہیں آئی جس سے اس قسم کے سرورق کی ممانعت ظاہر ہوتی ہو، اس نے مزید کہا کہ بیٹینا کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا بلکہ وہ تو اپنی کتاب کی تشہیر کے لیے ہر قسم

کا حربہ استعمال کرنا چاہیں گی اس کے علاوہ اگر اس قسم کی فلم میں اداکاری کی پیش کش بھی ان کو ہوئی تو وہ اس کے لیے بھی تیار ہو جائیں گی ، اس سرورق سے وہ اسی نکتہ کو اجاگر کرنا چاہتے ہیں ، اس اڈیشن پر وزیر خارجہ گیڈو ویسٹرو نے اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ایسے تمام اقدامات سے پرہیز ضروری ہے جو انتہا پسند مسلمانوں میں اشتعال کا سبب بنیں ، اظہار رائے کی آزادی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دیگر مذاہب کی تذلیل و توہین کی جائے ، اس سے قبل ٹائیٹینک پر پاپائے روم کی تصویر شائع ہوئی تھی جس کی ۷۰ فیصد زیادہ کاپیاں فروخت ہوئی تھیں ، جب کہ کیتھولک فرقہ کو اس پر اعتراض تھا اور پاپائے روم کی جانب سے اس کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کی کوشش بھی ہوئی تھی ، ظاہر ہے اس کا مقصد دلآزاری ، سستی شہرت اور حصول دولت کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

''اسلام ایک مثالی مذہب''

کانپور سے تعلق رکھنے والے سوامی لکشمی شنکر اچاریہ ہندوؤں کے معروف مذہبی پیشوا ہیں ، ''اسلام اور آتنک واد کا اتہاس'' لکھ کر خوب شہرت و مقبولیت حاصل کی ، متعدد زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ہوئے ، اسلام دشمنی اور اسلام کو دہشت گردی کی جانب منسوب کرنے میں انہوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ گذار دیا لیکن ۲۰۰۷ء میں سیرت طیبہ پڑھنے کے بعد انہوں نے جب قرآن کا مطالعہ شروع کیا اور آیتوں کے شان نزول اور پس منظر سے واقف ہوئے تو ان کی آنکھیں کھل گئیں اور سارے مطالب اور فکر و نظر کے انداز ہی بدل گئے اور اپنی گذشتہ تحریر پر شرمندہ و شرمسار ہوئے ، پھر ۲۰۱۰ء میں ''اسلام آتنک یا آدرش'' نام سے دوسری کتاب منظر عام پر آئی ، اردو ، انگریزی ، آسامی ، ملیالم ، مراٹھی میں اس کے ترجمے ہوئے ، تمل ، گجراتی ، تیلگو اور بنگلہ میں اس کے ترجمے ہو رہے ہیں ، اب انہوں نے ''اسلام ایک مثالی مذہب'' نامی کتاب لکھی ہے جس میں خیال ظاہر کیا ہے کہ دہشت گردی سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں ہے اس کی تعلیمات پوری انسانیت کے تحفظ کی ضامن ہیں یہ وہ مذہب ہے جو دہشت گردی کی سب سے پرزور انداز میں مخالفت کرتا ہے۔

''امریکی فوجیوں میں خودکشی کے رجحانات میں اضافہ و تدارک''

امریکی فوجیوں میں خودکشی کے رجحانات میں اضافہ اور اس سے نجات کی تدبیروں پر مشتمل

ایک دلچسپ رپورٹ امریکی جریدہ ''بالٹی مورسن'' میں شائع ہوئی ہے، اس کے مطابق افغانستان سمیت دیگر خلیجی ممالک میں واقع ملیٹری اکیڈمیز میں روزانہ ایک فوجی کے خود کو ہلاک کرنے کا اندازہ کیا گیا ہے۔ اکیڈمیز سے وابستہ ۲۰۰۵ء میں ۸۷، ۲۰۱۱ء میں ۱۶۵ جبکہ سال رواں میں ۲۴/ستمبر تک ۱۴۰ فوجیوں نے خود کو اپنے ہاتھوں موت کے گلے لگایا، ماہرین نے اس کے اسباب کا پتہ لگا کر بتایا کہ میدان جنگ کا دباؤ، انتشار ذہنی، گھریلو جھگڑے، مالی پریشانی، دوستوں اور اہل خانہ کی بے وفائی وغیرہ اس کا اہم سبب ہیں، ڈاکٹر ایڈم کیپلین نے اپنی تحقیق میں جنگ کے سبب معذوری، زخموں سے عدم صحت یابی، مے نوشی اور منشیات کی لت کو وجہ قرار دیا، ایک نے کہا کہ میدان جنگ کے غمزدہ واقعات اور ساتھیوں کی ہلاکت سے پہنچنے والے صدمہ کا اعلیٰ افسران کی جانب سے عدم تدارک منفی رجحان کا اہم سبب ہے جو بالآخر خودکشی پر منتج ہوتا ہے، اس صورت حال سے نبرد آزما ہونے کے لیے ماہرین نے Mandatorry Sucide Prevention Training کا آغاز کیا ہے، اس پروگرام کے تحت فوجیوں کو تنہائی اور مایوسی سے دور، پسندیدہ مشاغل میں مصروف اور باہمی مسائل سے آگاہ رہنے کی ترغیب دی جاتی ہے اور انہیں ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ ایسے ساتھیوں پر نگاہ رکھیں جو روزمرہ کے کاموں میں دلچسپی نہیں لے رہے ہیں یا اپنے ساز وسامان فروخت تو نہیں کر رہے ہیں یا تنہائی کا شکار تو نہیں ہو رہے ہیں، ایسے فوجیوں کی حرکات وسکنات پر نظر رکھنا، ان کو اکیلے نہ چھوڑنا اور ان کو قنوطیت کے احساس میں مبتلا ہونے سے بچانا ضروری ہے، اس صورت حال پر قابو پانے کی یہی تدبیریں ہیں۔

''سعودی خواتین کو قانونی مشیر بننے کی اجازت''

روزنامہ الریاض کے مطابق سعودی وزارت انصاف نے ماہرین قوانین اور مذہبی اداروں سے طویل مشورہ کے بعد خواتین کو بعض مخصوص جگہوں پر قانونی پیروی کی اجازت دینے کا فیصلہ کیا ہے اور وہ بینکوں اور کمپنیوں میں بطور قانونی مشیر کام کر سکتی ہیں مگر ان کو ابھی تمام سرکاری عدالتوں میں مؤکلوں کی باقاعدہ پیروی اور بحث ومباحثہ اور لاء لائیسنس نہ رکھنے کی صورت میں لا فرم کھولنے کی اجازت نہیں ہے، اس کی اجازت کے لیے وزارت انصاف ضروری کارروائی کر رہی ہے۔

ک،ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

علامہ اقبال اور فاروقی

۱۳/۱۱/۱۲ء

156-B/9-B, Shams Nagar
Karaila Bagh, Allahabad

بخدمت گرامی!

مدیر معارف السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معارف اکتوبر ۲۰۱۲ء ملا، اس شمارے میں جناب سید عبدالباری صاحب کا خط پڑھ کر حیرت ہوئی، انہوں نے اپنے خط میں معارف کی مجلس ادارت میں ''ایک نام'' (محترم شمس الرحمٰن فاروقی) کے ہونے پر حیرت اور افسوس ظاہر کیا ہے اور فاروقی صاحب کو اپنی آبرو بچانے کا مشورہ بھی دیا اور اس کا طریقہ بھی بتایا کہ ''کاش زندگی کے آخری دور میں وہ اقبال پر کچھ لکھ کر اپنی علمی آبرو کو محفوظ رکھتے''۔

اقبال پر شمس الرحمٰن فاروقی کے مضامین انگریزی اور اردو میں کم سے کم چالیس برس کے عرصے سے ہند اور بیرون ہند سے شائع ہوکر سنجیدہ قارئین سے خراج تحسین وصول کرتے رہے ہیں اور اقبال فہمی میں ہر طرح سے معاون ثابت ہوتے رہے ہیں۔

عبدالباری صاحب کو بہ ظاہر تحقیقی کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے ورنہ وہ ان مضامین میں سے کچھ کے نام سے ضرور آشنا ہوتے۔ کم سے کم فاروقی کو اقبال پر لکھنے کا مشورہ دینے سے پہلے ان کو فاروقی کی تحریروں کا ضرور مطالعہ کر لینا چاہیے تھا۔

عبدالباری صاحب اور ان کے ہم خیال حضرات (اگر ہیں) کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اقبال پر فاروقی صاحب کی دو مستقبل کتابیں ہیں۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱- خورشید کا سامان سفر- شعر اقبال پر کچھ تحریریں، مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، پاکستان، ۲۰۰۷۔

اسی کتاب کا دوسرا اڈیشن ایم آر پبلی کیشنز، دہلی سے ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا۔

اس کتاب میں شامل مضامین کی فہرست حسب ذیل ہے:

۱- یے ٹس، اقبال اور الیٹ۔ ۲- آسمان کے بدلتے ہوئے رنگ، غالب اور اقبال۔ ۳- اقبال

کا لفظیاتی نظام ۔۴- اقبال کا عروضی نظام ۔۵- تفہیم اقبال ۔۶- اقبال کے حق میں ردعمل ۔۷- اردو غزل کی روایت اور اقبال ۔

۲- دوسری کتاب اقبال اکیڈمی، لاہور، پاکستان سے ۲۰۰۷ میں شائع ہوئی ۔ یہ کتاب انگریزی میں ہے اور اس کا عنوان ہے:

How to read Iqbal Essays on Iqbal, Urdu Poetry & Literary Theory

اس کتاب میں اقبال سے متعلق مضامین کی فہرست حسب ذیل ہے:

1-How to read Iqbal? 2-Is Iqbal the Poet, Relevant to us Today? 3-Iqbal's Romantic Dilemma 4-Iqbal, the Riddle of Lucretius, and Ghalib 5-The Image of Satan in Iqbal and Milton

مندرجہ بالا مضامین کے علاوہ دو تبصراتی مضامین بھی ہیں:

1-A complaint against Khushwant Singh's Complaint and Answer

2-Iqbal-A Selection of the Urdu Verse: Text and Translation

انگریزی کتاب کا پہلا مضمون How to read Iqbal? جو دراصل اقبال پر یادگاری خطبہ تھا، لاہور کے ایک مجمع کثیر میں پیش کیا گیا تھا، پھر اقبال اکیڈمی ہی نے ایک پمفلٹ کی صورت میں 2005 میں اسے شائع کیا ۔ یہ اس قدر مقبول ہوا کہ اقبال اکیڈمی نے اس مضمون کے ساتھ فاروقی صاحب کے دیگر اقبالی مضامین جمع کر کے ایک پوری کتاب شائع کر دی، جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے ۔

حال ہی میں فاروقی صاحب کا ایک معرکہ آرا مضمون ''اقبال کا اقبال'' جو ۲۰۱۰ء میں لاہور کی بین الاقوامی اقبال کانفرنس میں پیش کیا گیا تھا، اب ہند و پاک کے مقتدر رسالوں میں شائع ہو کر ہر طرف پھیل چکا ہے ۔ پہلی بار یہ مضمون ''دنیازاد'' کراچی کے کتابی سلسلے نمبر ۲۸ بابت اگست ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا تھا ۔

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ چونکہ فاروقی صاحب معارف کی مجلس ادارت میں شامل ہیں تو آپ کے لیے اور بھی مناسب تھا کہ عبدالباری صاحب کے خط کی نقل فاروقی صاحب کو بھیج کر ان کا جواب یا ان کی رائے بھی حاصل کر لیتے اور دونوں خطوط ایک ساتھ شائع کیے جاتے ۔

والسلام

محمد صہیب

مطالعۂ اقبال

مولانا آزاد اردو نیشنل یونیورسٹی،
لکھنؤ کیمپس، لکھنؤ۔

مکرمی و محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

معارف کے تازہ شمارہ میں ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی کا خط پڑھا۔ اطلاعاً عرض ہے کہ علامہ اقبال پر شمس الرحمٰن فاروقی کے مضامین کا مجموعہ ''خورشید کا سامان سفر'' ۲۰۰۷ء میں آکسفورڈ پریس کراچی نے کتابی صورت میں شائع کیا تھا۔ اس کتاب میں یے ٹس، اقبال اور الیٹ نامی مضمون شامل ہے جو ان کی مشہور کتاب شعر غیر شعر اور نثر میں بھی موجود ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا تھا۔ ''آسماں کے بدلتے ہوئے رنگ غالب اور اقبال'' نامی مضمون ۱۹۶۲ء کے آس پاس فکر ونظر میں شائع ہوا تھا۔

کتاب کے دیباچے میں فاروقی صاحب نے لکھا ہے کہ ''میرے والد مرحوم کی توجہ اور کوشش کی بدولت مجھے بچپن ہی میں اقبال کا کلام اور پیغام دونوں سے کچھ آشنائی ہوگئی تھی۔ اقبال کو پوری طرح سمجھنے کا دعوی تو میں شاید اب بھی نہیں کرسکتا لیکن اقبال سے پوری محبت رکھنے کا دعوی کرسکتا ہوں''۔

دیباچے میں آگے فاروقی صاحب نے مزید لکھا ہے کہ ''اقبال پر میں نے ہمیشہ اپنا کچھ اسی طرح کا حق سمجھا جس طرح کا حق اپنے والد پر سمجھتا تھا کہ وہ مشکل کے وقت میری دستگیری کریں گے کوئی مسئلہ پوچھوں گا تو صحیح حل بتائیں گے بھٹک جاؤں گا تو رہنمائی کریں گے''۔

کتاب کا مقدمہ کافی دلچسپ اور اہم ہے نیز ''اقبال کا لفظیاتی نظام'' ہر اس شخص کو پڑھنا چاہیے جو اقبال پر کچھ لکھنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

۲۰۰۷ء میں اقبال اکادمی پاکستان نے شمس الرحمٰن فاروقی کی علامہ اقبال انگریزی کتاب How to Read Iqbal شائع کی تھی۔ ممکن ہے اس کے علاوہ بھی فاروقی صاحب نے اقبال پر لکھا ہو۔ سردست یہ چیزیں یاد آرہی ہیں۔

اس طرح کا خط لکھنے سے پہلے اقبال پر فاروقی کی تحریروں کا مطالعہ ضروری تھا۔ والسلام

عمیر منظر

تلخیص و ترجمہ

بعض مصادر سیرت نبویؐ کا جائزہ و تجزیہ

مولوی فضل الرحمٰن اصلاحی قاسمی

''مصادر سیرت پر ڈاکٹر ضیف اللہ یحییٰ الزہرانی کے قابل قدر رسالہ کی ایک بحث کی تلخیص پیش خدمت ہے''۔ (معارف)

مصادر سیرت نبویؐ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، ایک وہ جس کا تعلق مصادر اصلیہ یعنی قرآن مجید، احادیث شریفہ کے مجموعوں، کتب سیر و مغازی اور شمائل و خصائل و دلائل نبوت سے ہے۔

دوسری قسم تکمیلی مصادر کی ہے جس میں تراجم، رجال، انساب، فقہ اور اشعار وغیرہ موضوعات پر مشتمل کتابیں ہیں، جن سے سیرت سرور عالمؐ کے نئے گوشے روشن ہوسکتے ہیں، انہیں مصادر سیرت پر گفتگو کی جائے گی، مصدر اول قرآن مجید ہے۔

قرآن مجید: یعنی کلام الٰہی جو حضرت محمد ﷺ پر وحی کی صورت میں نازل کیا گیا، اسی قرآن کے ذریعہ نبوت، رسالت اور رسولوں پر ایمان لانا ثابت ہے اور اسی پر تفکر و تدبر سے اس کے معانی وحقائق آشکارا ہوتے ہیں، تشریعی امور اور تکوینی معاملات میں وہی ذریعہ ہدایت و بصیرت ہے۔

قرآن مجید میں متعدد انبیائے کرام کی حیات طیبہ کی جھلکیاں ہیں، کہیں مختصر اور کہیں قدرے مفصل، دونوں صورتوں میں مقصود دراصل ان واقعات وحقائق کا بیان ہے جو تاریخ انسانی میں پیش آکر رہے لیکن ظالموں نے ان کو بجائے تسلیم کرنے کے عصیان و طغیان ہی پر اصرار کیا۔

رسول اکرمؐ کی سیرت کا ماخذ اول قرآن اس لیے ہے کہ قرآن مجید نے بعض اہم غزوات مثلاً غزوۂ بدر، احد، خندق اور حنین کا واضح ذکر کرکے اس کے اہم ترین گوشوں کو واضح کیا

اسکالر دار المصنّفین، اعظم گڑھ۔

ہے، سیرت رسولؐ میں ان غزوات کے بیان میں ظاہر ہے یہ قرآنی بیانات سب سے اہم، مستند اور معتبر ہیں۔ اسی طرح بعض آیات میں غزوہ بدر اور غزوہ تبوک وغیرہ کے حالات کا بیان ہے، سورہ شعرا (۲۱۴ - ۲۱۶) اور سورہ حجر (۹۴ - ۹۶) وغیرہ میں ان مصائب و مشکلات کا ذکر ہے، جو فریضہ دعوت وتبلیغ کی ادائیگی میں آپؐ کو پیش آئیں، دعوت کے ابتدائی حالات کا علم سورۃ العلق، مدثر، مزمل اور سورہ ضحیٰ سے ہوجاتا ہے، آپؐ کے حسن اخلاق وسیرت کے ثبوت کے لیے سورہ قلم کی آیت ۴ ''انک لعلی خلق عظیم'' وغیرہ پیش کی جاسکتی ہے۔

کتب حدیث: شریعت اسلامیہ کا دوسرا ماخذ سنت نبویؐ یعنی آپؐ کے اقوال، افعال اور صفات عالیہ ہیں، یہیں سے سیرت وسنت میں باہمی تعلق کی نوعیت اور گہری مناسبت کا علم بھی ہوتا ہے، اس لیے کہ حدیث وسنت کے موضوع پر جو بھی کتابیں تحریر کی گئیں وہ حیات رسولؐ کے تذکرے کے ساتھ اپنے دامن میں غزوات وخصائص نبویؐ کو بھی سمیٹے ہوئے ہیں، اس لحاظ سے حدیث کا معتد بہ حصہ سیرت رسولؐ پر مشتمل ہے، حدیث کی اولین کتاب مؤطا میں ایک باب غزوات وسیرت نبویؐ کے لیے خاص ہے۔

اسی طرح صحیحین کا ایک بڑا حصہ مواد سیرت سے متعلق ہے جس میں آپؐ کے فضائل و مناقب، بعثت سے قبل کے واقعات، جہاد اور غزوات وسرایا کے حالات کا تذکرہ ہے اس کے علاوہ ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، نسائی، دارمی اور مسند ابن حنبل میں سیرت کے مختلف پہلوؤں پر مستند مواد موجود ہے، اس کی تحقیق وتدقیق اور چھان بین میں محدثین عظام نے بڑی جانفشانیاں کیں اور اصول نقد و جرح وضع کرکے احادیث کے پرکھنے کا معیار مقرر کیا اور نقد و جرح فن حدیث کا خاصہ بن گیا، کتب سیر وتاریخ اس محتاط اصول کی کارفرمائی سے خالی ہیں، کتب حدیث میں غزوات وسیرت کے دوسرے پہلوؤں کی تفصیل اس لیے نہیں کی گئی کہ اس کے لیے الگ سے کتابیں لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور فن سیرت وجود میں آیا۔

کتب سیرت: مصدر سیرت کی اس قسم کو دو ادوار میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔ پہلے دور میں سیرت نبویؐ، زبانی روایتوں پر مدون ہوئی اور دوسرے دور میں یہی مواد تدوین وتالیف کے مراحل سے گذر کر کتابوں میں نقل ہوا اور خاص سیرت کی کتابیں منظر عام پر آئیں۔

پہلے مرحلہ یعنی سیرت نبویؐ کی زبانی تدوین کا تعلق صحابہ کرامؓ اور بعض تابعین کے سیرت نبویؐ سے شغف واہتمام سے ہے کہ صحابہ کرامؓ نے آنحضورؐ کے آغوش تربیت میں پرورش پائی، آپؐ سے حسن سیرت کے اسباق اور زندگی کے آداب سیکھے اور آپؐ کی مکمل اتباع کی، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ اور حضرت براء بن عازبؓ وغیرہ نے سیرت کے اہتمام میں خاص شہرت حاصل کی، عبداللہ بن عباسؓ کو مغازی رسولؐ، عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کو تدوین احادیث کے اہتمام اور براء بن عازبؓ کو ہجرت نبوی اور بدر واحد اور خندق وحدیبیہ وغیرہ سے متعلق مرویات کے سبب شہرت ملی اور ان تینوں سے ان کے تلامذہ، حضرات تابعین اور سارے لوگوں نے خوب استفادہ کیا اور یہی سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ اخبار و سیر کا بڑا حصہ ذخیرہ زبانی روایتوں کی صورت میں محفوظ ہوگیا۔ مصادر سیرت کا جائزہ

اس کے بعد جلیل القدر تابعین نے بھی سیرت سے دلچسپی لی۔ جیسے حضرت عروہ بن زبیرؒ (۹۳ھ) کی بے شمار سیرتی روایات طبری اور فتح الباری میں موجود ہیں، ابن کثیرؒ نے ان کو **عالماً بالسیر** اور **هو اول من صنف فی المغازی** کے لقب سے یاد کیا ہے، آیات قرآنیہ اور اشعار سے استشہاد، انساب اور آنحضورؐ کے وثائق اور مکاتیب کا کثرت سے اہتمام، مغازی میں ان کا خاص منہج ہے۔

حضرت عامر بن شرحبیلؒ (۱۰۳ھ) مشہور محدث ہیں، المغازی ان کی مشہور کتاب ہے، عبداللہ بن عمرؓ کا قول ہے کہ مغازی کے سب سے بڑے عالم وحافظ شرحبیلؒ ہیں، ابان بن عثمان (۱۰۵ھ) نے مغازی کی روایات مغیرہ بن عبدالرحمٰنؒ سے حاصل کیں، شرحبیل بن سعد المدنی (۱۲۳ھ) کے متعلق ابن عیینہؒ کا بیان ہے کہ غزوات اور بدری صحابہؓ کے حالات کا ان سے بڑھ کر واقف کوئی نہیں تھا۔ محمد بن مسلم بن شہاب زہری سیرت کے ثقہ عالم تھے، ابن اسحاق نے سیرت میں زیادہ تر انہیں پر اعتماد کیا، یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے جمع اسناد کا طریقہ اپنایا، اسی وجہ سے فن سیرت پر ان کی روایات کو درجہ استناد حاصل ہے، عاصم بن عمرو بن قتادہ انصاری (۱۲۹ھ) پر ابن اسحاق اور واقدی نے اعتماد کیا ہے، ان کو مغازی وسیر کا بہت علم تھا، مسجد دمشق میں یہ لوگوں کو مغازی کی تعلیم دیتے تھے۔ موسیٰ بن عقبہ (۱۴۰ھ) کی مغازی پر کتاب کو علمائے سیر نے اصح کتب المغازی

قرار دیا، یہ زہری کے شاگرد تھے، سلیمان بن طرحان (۱۴۳ھ) کی **السیرۃ الصحیحہ** کے بعض اجزا ہی آج محفوظ ہیں، ان کا شمار علمائے جرح وتعدیل اور محدثین میں ہوتا ہے، محمد بن اسحاق (۱۵۱ھ) ایرانی النسل تھے لیکن ان کی تعلیم وتربیت مدینہ منورہ میں ہوئی، ان کو **اعلم الناس بالمغازی** کی حیثیت سے جانا جاتا ہے، سیرت پر ان کی روایات کو ابن ہشام نے اپنی تصنیف **السیرۃ النبویہ** میں جمع کردیا ہے۔

ان کے علاوہ ابومعشر السندی (۱۷۱ھ)، عبداللہ بن محمد بن ابی بکر المدنی (۱۷۶ھ)، یحییٰ بن سعید اموی (۱۹۴ھ)، الولید بن مسلم دمشقی (۱۹۶ھ)، یونس بن بکیر (۱۹۹ھ)، محمد بن عائذ دمشقی وغیرہ نے بھی سیرت پر کتابیں لکھیں، سیرت کے موضوع پر ایسی کتابوں کو بھی سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے جو تابعین و تبع تابعین کی جانب منسوب ہیں یا جن کی مرویات کی خاصی تعداد کتب سیر وتاریخ میں پائی جاتی ہیں۔ ایسے رواۃ میں حضرت عکرمہ مولی بن عباس (۱۰۷ھ)، ابواسحاق عمرو بن عبداللہ السبیعی (۱۲۷ھ)، یعقوب بن عتبہ بن المغیرہ (۱۲۸ھ)، داؤد بن الحسین الاموی (۱۳۵ھ)، عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز الحنفی (۱۶۲ھ)، محمد بن صالح بن دینار (۱۶۸ھ)، عبداللہ بن جعفر المخرمی المدنی (۱۷۰ھ) کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

مصادر سیرت کے اس اجمالی جائزہ ومطالعہ کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ صحابہ کرامؓ، تابعین و تبع تابعین وغیرہ نے سیرت کی حفاظت وصیانت میں جو اہم خدمات انجام دی ہیں، ان کی حقیقت یقیناً مصدر وماخذ کی ہے، اگر انھوں نے عظیم قربانیاں پیش نہ کی ہوتیں تو سیرت کے اجزاء بعض منتشر اوراق یا عام تاریخی کتابوں میں تو مل جاتے مگر سیرت کا یہ مہتم بالشان کارنامہ منظر عام پر نہ آتا، تدوین سیرت میں محدثین کے طرز کے مطابق عدالت وضبط کے اصول بھی پیش نظر رکھے گئے جس کے سبب فن سیرت میں تحریف وتبدیلی اور مبالغہ کو راہ نہ مل سکی اور آنحضورؐ کی حیات طیبہ کا مستند خاکہ متاخرین تک پہنچا۔

(ماخوذ از: مصادر السیرۃ النبویہ، دراسۃ تحلیلیہ لبعض مصادر السیرۃ النبویۃ)

آثار علمیہ و تاریخیہ

مولانا شبلیؒ کے چھ نو دریافت خطوط

زیر نظر خطوط مولوی احسن اللہ خاں ثاقب (۱۸۶۳-۱۹۳۵ء) کے نام ہیں۔ جو امیر مینائی کے شاگرد تھے اور وکٹوریہ کالج گوالیار میں عربی و فارسی کے پروفیسر تھے۔ مولانا شبلی سے خاصے مراسم تھے۔ لیکن شبلی کی سوانح اور دوسری تحریروں میں ان کا ذکر نہیں ملتا۔ وہ شبلی کے مکتوب الیہ بھی ہیں لیکن مکاتیب کی دونوں جلدوں اور باقیات شبلی میں ان کا مذکور نہیں۔ مولانا شبلی نے ان کی مرتبہ کتاب ''مکاتیب امیر مینائی'' (طبع دوم لکھنؤ ۱۹۲۴ء) پر تقریظ لکھی تھی جو ''نوشتہ شمس العلماء حضرت مولانا شبلی نعمانی'' کے عنوان سے اس ایڈیشن میں شامل ہے۔ شبلی کی یہ تقریظ شبلی کے کسی مجموعہ مضامین میں شامل نہیں ہے۔ مکاتیب امیر مینائی کے نسخے بھی نایاب ہیں۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے اس تقریظ کی دریافت کی اور اپنے مضمون ''علامہ شبلی نعمانی شخصیت، افکار اور کچھ نئی باتیں'' (مطبوعہ معارف، مئی ۲۰۰۸ء) میں اس تقریظ کو نقل کر دیا ہے۔

حال ہی میں ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی کتاب ''شبلی سخنوروں کی نظر میں'' (مطبوعہ اعظم گڑھ ۲۰۱۲ء) شائع ہوئی۔ اس میں انہوں نے شبلی کی وفات پر ثاقب کے دو تاریخی قطعات (بہ زبان فارسی) نقل کیے ہیں۔ یہ قطعات انہوں نے ثاقب کی عربی، فارسی و اردو نگارشات کے مجموعہ ''گوہرین نامہ'' (انوار المطابع لکھنؤ، ۱۳۴۱ھ/۲۳-۱۹۲۲ء) سے اخذ کیے ہیں۔ ثاقب کے تعارف میں انہوں نے شبلی سے ان کی مراسلت اور زیر نظر خطوط کا تذکرہ کیا ہے (ص ۷۱)۔ ابھی تک یہ خطوط مذکورہ بالا تقریظ کی طرح پردہ گمنامی میں تھے۔ ''مکاتیب امیر مینائی'' کی طرح ثاقب کا مجموعہ مضامین ''گوہرین نامہ'' بھی نایاب ہے۔ لہٰذا ان خطوط کو ہدیہ ناظرین معارف کیا جا رہا ہے۔ امید ہے شبلی کے دوستوں اور مکتوب الیہ میں ایک نئے مگر ذی علم فرد کے اضافے کو

پسند کیا جائے گا۔

(ڈاکٹر شمس بدایونی)

نامہ مرسلہ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی مرحوم

(۱)

تسلیم، ۳۰/ تک تو کانفرنس ہے، راہ میں شاید ایک آدھ دن مظفر پور میں قیام کرنا ہو، پھر لکھنؤ آؤں گا۔

یہاں کی آب و ہوا بہت ہی خراب اور مضعف ہے، مجھ کو بڑی تکلیف ہے۔ کیا کروں اب تو آ گیا اور کانفرنس تک ٹھہرنا پڑا، خان خاناں عبدالرحیم کی نہایت مفصل لائف ہے جس میں دور اکبری کے شعراء کا مفصل تذکرہ ہے، ساتھ لاؤں گا۔ والتسلیم شبلی امر تلا لین، نمبر ۵، کلکتہ، ۲/ دسمبر ۱۹۰۶ء۔

(۲)

مکرمی، تسلیم، لکھنؤ جاؤں تو ارشاد کی تعمیل کر سکوں، ابھی وہاں سخت طاعون ہے، موازنہ میں دو تین ہفتہ کی دیر ہے، ایک غزل خیال میں آئی

نشد ہرگز کہ آن بدعہد حرف راستی گوید بافسوں سازی و نیرنگ آزادست پنداری

اردوے معلّٰی کی نذر رہے، ان کا بقایا مدت سے چلا آتا ہے۔ والتسلیم

شبلی، ۱۲/ اپریل ۱۹۰۷ء

(۳)

تسلیم، الہ آباد سے میں اعظم گڑھ آیا اور ابھی مہینہ بھر تک رہوں گا۔ موازنہ چھپ گیا لیکن ابھی مطبع میں ہے، شعر العجم ہنوز دہلی دور است۔ پروفیسر آزاد کی سخندان فارس کا دوسرا حصہ نکلا، دیکھنے کے قابل ہے۔ شبلی، ۱۳/ مئی ۱۹۰۷ء اعظم گڑھ

(۴)

محبوب، حبیب میرا حال کیوں پوچھتے ہیں، اس حادثہ میں انہوں نے جو سرد مہری ظاہر کی کسی نے

نہیں کی، بیگم صاحبہ بھوپال اور نواب ڈھاکہ تک نے جوابی تار بھیجے، لندن سے محمڈن ایسوسی ایشن نے ہمدردی کا رزولیوشن پاس کر کے بھیجا، لیکن ہمارے محبوب نے کارڈ پر ٹالا، تاہم مجھ کو شکایت نہیں، میں ان کو چاہتا ہوں، وہ مجھے چاہیں یا نہ چاہیں، میں اچھا ہوتا جاتا ہوں لیکن کس کام کا۔

شبلی، ۲۰؍جولائی ۱۹۰۷ء

(۵)

دارالعلوم ندوہ، لکھنؤ، ۲۱؍ستمبر ۱۹۰۷ء

جناب من، تسلیم، یہ تو آپ نے ایسی خبر سنائی کہ بجائے اس کے کہ آپ کو مبارک باد دوں جی چاہتا ہے کہ مجھ کو مبارک باد دیں، مجھ کو بخار آ گیا تھا، اب بھی کچھ اثر ہے۔ جس دن سفر کے قابل ہوا اسی دن بھوپال پہنچ کر رو در رو مبارک باد دوں گا، والسلام شبلی۔

بندہ (۱) حمید فراہی حاضر ست و اظہار کمال مسرت می نماید و سلام شوق می گذارد۔

(۶)

تسلیم، گوالیار مبارک، ہمارے کہاں نصیب کہ وہاں پہنچ سکیں، ہاں کبھی بمبئی آیئے تو زیارت ہو، حیدرآباد اسلامی ریاست تھی اس کو آپ نے کیوں خیر باد کہا۔

شبلی، ۲۲؍جولائی ۱۹۱۳ء، بمبئی۔

(گوہرین نامہ، ص ۲۰۶-۲۰۷)

---

(۱) مولانا حمید الدین، بی اے ۱۲۔

ادبیات

غزل

جناب وارث ریاضی صاحب

محبت کا موسم بڑا دل کشا ہے
غمِ آرزو کا چمن کیف زا ہے

ترا غم ، تری یاد ، تیرا تصور
جو ملنا تھا تقدیر میں مل گیا ہے

ابھی تک یہ میری سمجھ میں نہ آیا
خوشی جاں ستاں ہے کہ غم جاں فزا ہے

چلی ہیں کچھ ایسی ہوائیں وفا کی
چراغِ جفا جھلملانے لگا ہے

ہزاروں کھلے ہیں چمن غم کے جس میں
مجھے میرے خالق نے وہ دل دیا ہے

ہنر نے ترے یوں کیا تجھ کو خود سر
جو تو چاہتا ہے وہی ہو رہا ہے

زمانے میں فرماں روائی ہے تیری
خدائی ہے تیری ، خدا بھی ترا ہے

مجھے دیکھتی ہے تعصب سے دنیا
مری دشمنی میں زمانا کھڑا ہے

یہ دنیا وہ اندھیر نگری ہے وارثؔ
جو مجرم نہیں ، دار پر چڑھ رہا ہے

کاشانۂ ادب سکٹا دیوراج، پوسٹ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن، بہار ۸۴۵۴۵۳۔

مطبوعات جدیدہ

مقالات جاوید: از ڈاکٹر جاوید اقبال، ترتیب و تدوین جناب محمد سہیل عمر، جناب طاہر حمید تنولی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۴۳۲، قیمت ۵۰۰ روپے، پتہ: اقبال اکادمی، ۱۱۶، میکلوڈ روڈ، لاہور، پاکستان۔

علامہ اقبال کے افکار و اشعار کی اشاعت میں اقبال اکادمی لاہور نے جس طرح اپنی فعالیت کا ثبوت دیا، استمرار و استقلال کے لحاظ سے واقعی کوئی اس کا ثانی نہیں، اکادمی کے ذمہ داران خصوصاً فاضل جلیل جناب محمد سہیل عمر کی معارف پروری اور دارالمصنّفین کی قدر افزائی ہے کہ وہ برابر اکادمی کی مطبوعات سے نوازتے رہتے ہیں، ہر کتاب اس لائق ہے کہ معارف میں مختصر ہی سہی، تذکرہ ضرور آئے اور ہندوستان میں اقبال کے شیدائیوں کے لیے کم از کم ان کا علم ہی سرور بخش ہو، ہمارے سامنے، سیر و سفر ہمارا، حرف بہ حرف، شعر دلآویز، راجہ حسن اختر بحیثیت اقبال شناس، اقبال عہد ساز شاعر اور مفکر، اقبال ریلیجن اینڈ فزکس آف دی نیو ایج وغیرہ کئی ایسی مفید کتابیں ہیں جن کے لیے دل چاہتا ہے کہ تفصیل سے ان کے مشمولات کا ذکر ہو، لیکن مطبوعات جدیدہ کی کثرت اور معارف میں اس کالم کے صفحات کی قلت کی وجہ سے جو تاخیر ہوتی ہے وہ صرف شرمساری کا باعث ہی ہوتی ہے، اقبال اکادمی کی مطبوعات کا مرکزی موضوع ظاہر ہے ''اقبالیات'' ہے لیکن اصلاً اب یہ علوم اسلامیہ کے عمیق و دقیق مطالعات کا موضوع ہے۔ مقالات جاوید بھی اسی سلسلہ کا ایک وقیع حصہ ہے جس کو اگر چہ تین حصوں یعنی اسلام کی سیاسی فکر، اقبالیات، پاکستانیات اور ادب میں تقسیم کیا گیا ہے لیکن ادب، فکر اور قانون و سیاست میں یہ اسلامی افکار کا وسیع تر مطالعہ ہے، ہر حصے میں ایسے مضامین ہیں جن پر جدا جدا اظہار خیال کی گنجائش ہے، مصنف، علامہ اقبال کے زندہ جاوید صاحب زادے ہی نہیں، ایک قانون داں اور صاحب فکر دانش ور کی حیثیت سے شان امتیاز کے حامل ہیں، یہ ضرور ہے کہ اس کے لیے انہوں نے اپنے والد علام کی ایک آرزو کو وصیت سمجھ کر حرز جان بنائے رکھنے کی کوشش کی کہ ''میں شاخ تاک ہوں، میری غزل ہے میرا ثمر، مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر۔ اس کتاب کے مضامین

میں نشہ و سر مستی اسی مئے لالہ فام کی ہے، خصوصاً اسلام میں ریاست کے تصور پر ان کی تحریریں قابل قدر ہیں اور لائق فکر و غور بھی، اگر چہ ان مضامین کے پس منظر میں پاکستان کے آفاق نمایاں ہیں اور ماحول بھی وہی ہے اس لیے اقبال کی ترجمانی میں جاوید صاحب کے بعض خیالات یا نتائج فکر اوروں کے لیے لغت غریب ہی نہیں عجیب بھی ہو سکتے ہیں، یہ بھی ہے کہ یہ خیالات غالباً مختلف اوقات و احوال کی مناسبت سے ہیں، اس لیے زمان و مکان کے اثرات بھی تلاش کیے جاسکتے ہیں، ان مضامین کی توقیت اگر ہو جاتی تو شاید بعض مقامات سے گزرنا آسان ہو جاتا، بہر حال اسلامی فلسفہ سیاست، مسلم قومیت، احیائے اسلام، اتحاد اسلام، اقبال کے اجتہادی، معاشی تصورات، نظریہ پاکستان اور زمینی حقائق اور ادب، کلچر اور خرد افروزی، ادیب، قوم پرستی اور لادینیت جیسے مضامین فکر و نظر کی دنیا کو اور روشن کرنے میں بلاشبہ کامیاب ہیں، وہ مضمون بھی شامل ہے جس میں انہوں نے علامہ اقبال کو ایک باپ کی شکل میں پیش کیا، یہ مضمون کثرت سے نقل ہوا اور ہر بار ایک نئے تاثر کے ساتھ پڑھا گیا۔

مضامین الندوہ (۱۰-۱۹۰۵ء) بحوالہ مولانا ابوالکلام آزاد : ترتیب و تدوین ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۹۶، قیمت ۲۷۵ روپے، پتہ: پورب اکادمی، اسلام آباد، پاکستان۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کے عبقری ہونے میں شبہ کی گنجائش نہیں، ایسی جامع کمالات شخصیات بس خال خال ہی پردۂ ہستی پر نمودار ہوتی ہیں پھر ان کے جمال جہاں افروز سے زمان و مکان جس طرح روشن ہوتے ہیں ان کی تحدید نہیں ہوسکتی، ایسے مجسمہ علم و فضل کا ہر نقش دیکھنے والوں کے لیے دلآویز ثابت ہوتا رہتا ہے، مولانا کے ہر نقش میں ثبات و دوام تلاش کرنے والوں میں زیر نظر کتاب کے فاضل مرتب بھی ہیں جنہوں نے دس سے زیادہ کتابیں اسی ذکر آزاد کے لیے نذر کردیں اس کے باوجود نئے نئے گوشے، ان کے ذہن میں آتے رہتے ہیں، یہ کتاب بھی اسی قسم کی ہے جس میں انہوں نے رسالہ الندوہ سے مولانا آزاد کے تعلق اور اس میں شائع ہونے والے مضامین کا استقصا کیا ہے، الندوہ دراصل علامہ شبلیؒ کی شخصیت کا آئینہ تھا، اس میں جو عکس ابھرتا، رنگ و آہنگ علامہ ہی کا ہوتا، ۱۹۰۵ سے ۱۹۱۰ء کا زمانہ وہ ہے جب علامہ شبلیؒ کا آفتاب

کمال نصف النہار پر تھا اور مولانا آزاد ہندوستان کے علمی افق پر ہلالی شان وشکل میں اپنے ظہور کا خود ہی مبشر ہو چکے تھے، عام لیکن برحق خیال ہے کہ علامہ شبلیؒ اور ندوے کی صحبتوں نے آزاد کو مولوی سے مولانا بنایا، فاضل مولف اس خیال کے قائل ہیں لیکن ظاہر ہے چند تحفظات کے ساتھ، ان کے طویل پیش لفظ میں ساری حکایت موجود ہے، تالیف کا اصل مقصد رسالہ الندوہ میں شائع ہونے والے مضامین آزاد کا احاطہ تھا، لیکن یہ مقصد یہیں تک محدود نہیں رہا، انہوں نے بطور تقدیم علامہ شبلیؒ، ندوہ، الہلال، سیرت نبویؐ جیسے مراحل کو بڑی خوبصورتی سے پیش کر کے کتاب کو مفید سے مفید تر اور دلچسپ تر بنا دیا، علامہ شبلیؒ کے سانحہ ارتحال کے بعد الہلال میں مولانا آزاد کی تعزیتی تحریر اور کلکتہ کے تعزیتی جلسہ میں ان کی تقریر کا علم بہتوں کو نہیں، یہ بھی اس کتاب میں شامل ہے، علامہ شبلیؒ کا ذکر بعض اور کتابوں میں جس طرح قلم آزاد سے ہوا اس کو بھی نقل کر دیا گیا اور اس طرح شبلیات کے شائقین کے لیے کچھ اور جاننے کی آسانی فراہم کر دی گئی تا کہ یہ نتیجہ اخذ کرنے میں تساہل نہ ہو کہ ''مولانا آزاد کی تحریر اور تحریک پر کوئی اور اثر ہے تو وہ شبلی ہی کا ہے''۔

مختصر تاریخ ثقافت اسلامی : از مولانا سید محمد واضح رشید ندوی، ترجمہ، تعلیق وحواشی ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۸۰، قیمت ۱۸۰ روپے، پتہ: دارالکتاب، دودھ پور، علی گڑھ اور علی گڑھ اور لکھنؤ کے دوسرے مشہور مکتبے۔

ثقافت کیا ہے اور اس کا اسلامی اظہار کن خصوصیات کی وجہ سے دوسری ثقافتوں سے کیوں ممتاز ہے؟ ان سوالوں کے جواب میں اسلام کی پندرہ سو سالہ تاریخ کی ایک سچی تصویر پیش کر کے، تعلیم وتدریس، تصنیف وتالیف، علم ودانش، شعر وحکمت، فلسفہ وتصوف، تعمیر وتزئین میں مسلمانوں کی خدمات کا ایک نہایت جامع اور دلکش مرقع اس کتاب کی صورت میں پیش کیا گیا ہے، مقصد تالیف یہ ہے کہ مغربی تہذیب وتمدن اور ثقافت کی مادہ پرستانہ کثافت اور آلودگی سے نجات کے لیے ثقافت اسلامی کے شاندار ماضی کی عظمتوں سے نئی نسل کو اس طرح روشناس کرایا جائے کہ صرف اپنی تاریخ سے ہی آگہی نہ ہو، یہ حقیقت بھی بدلائل ذہن نشیں ہو جائے کہ اسلام نے دوسری قوموں کو ظلمت وذلت ومسکنت کی لعنتوں سے پاک کر کے ایسی عالم گیر انسانی ثقافت سے ہم کنار کیا جو خیر، حسن اور افادیت کا سب سے عمدہ نمونہ ہے، جس کی جامعیت کا یہ عالم ہے کہ

یہ ثقافت ،عربی ، یونانی ، ایرانی اور ہندوستانی خاص کا عطر مجموعہ بن گئی ، فاضل مصنف دار العلوم ندوۃ العلماء میں اسلامی ثقافت اور علوم وفنون کے استاذ اور عربی زبان کے مستند صاحب قلم ہیں ، وسعت مطالعہ کے ساتھ فکر ونظر کی گہرائی اور ذہن وقلب کی پاکیزگی کی نعمتوں سے بہرہ یاب ہیں ، ان کے مطالعہ اور تجزیہ نے عربی زبان کو اس بیش قیمت کتاب کا تحفہ دیا ، اردو میں منتقل کرنے کی ضرورت لائق مترجم نے بجا طور پر محسوس کی ، طارق ایوبی نوجوان ہیں ہونہار ہیں ، ان کے قلم میں بجلیاں مستور ہیں ، ان کے اس ترجمہ نے ان دعوؤں کو صحیح ثابت کیا ہے لیکن سب سے زیادہ لائق داد ان کے حواشی اور تعلیقات ہیں ، بیسیوں کتابوں ، سینکڑوں اشخاص اور مقامات پر ان کے حواشی ان کی محنت وتحقیق کے شاہد ہیں ، صرف ایک باب سے متعلق حواشی میں ، ابن مقفع ، یعقوب بن لیث ، ادریس بن عبداللہ ، بنواغلب ، قرامطہ ، بنو بویہ ، عضدالدولہ ، ابن العمید ، ابن عباد ، وزیر مہلبی ، ابومسلم اصفہانی ، بدیع الزماں ہمدانی ، الصابی ، خوارزمی ، اخشدیہ ، سلاجقہ ، زنگی ایوبی ، بنوعباد ، جہوریہ ، مرابطین ، موحدین ، بنواحمر وغیرہ پر بڑے جامع اور پر از معلومات حواشی ، ایک نظر میں صدیوں کا منظر نامہ پیش کر دیتے ہیں ، ان کے بعض تعلیقات میں معصوم جوش بھی لطف دے جاتا ہے جیسے ایک جگہ وہ یہ نوٹ دیتے ہیں کہ ''اگر خطیب بغدادی نے ماتمی جملے اپنے عہد کے لیے لکھے تو پھر ہمارے لیے اب کچھ لکھنے کو نہیں باقی رہ جاتا کہ عروج بغداد جانے کتنی بار سقوط بغداد ہوا ، تاریخ نے متعدد بار اس کی کئی داستانیں لکھیں ، ہمارے عہد اور اس سے پہلے خطیب کے عہد تک سوائے سقوط کے اور کیا حاصل ہوا'' ، ہر صاحب ذوق خصوصاً تاریخ اسلام کا منصفانہ مطالعہ کرنے والوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے ۔

شرح تحفۃ الاعراب : از علامہ حمید الدین فراہیؒ ، شرح مولانا احتشام الدین اصلاحی ، متوسط تقطیع ، عمدہ کاغذ وطباعت ، صفحات ۶۷ ، قیمت ۳۰ روپے ، پتہ : البلاغ پبلی کیشنز : ۱۰- اعظمی اپارٹمنٹ ، این -۱ ، ابوالفضل انکلیو ، جامعہ نگر ، نئی دہلی ۲۵ ۔

چند صفحات کا یہ رسالہ اپنے موضوع اور افادیت کے لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے ، ترجمان القرآن مولانا فراہیؒ کو عربی عربی زبان وادب میں جو غیر معمولی مہارت حاصل تھی ، اس کا ایک اظہار نحوی مسائل کے بیان میں اس رسالہ کے ذریعہ ہوا ، لطف یہ ہے کہ یہ اردو میں ہے

اور منظوم ہے، اب فاضل شارح نے مزید آسانی کے لیے اس کی شرح کر دی ہے۔

میزان آگہی : از ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۲۸، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: عدیلہ پبلی کیشنز، ڈومن پورہ (کساری) مئوناتھ بھنجن، یوپی۔

ڈاکٹر نسیم اعظمی کا تعارف نثر نگار کی حیثیت سے کیا جاتا ہے خصوصاً تعلیمی مسائل میں ان کی کتابوں نے بڑی شہرت اور وقعت حاصل کی، ادبی گزٹ رسالہ کی ادارت نے ان کی خوشبوئے نثر کو اور عام کیا لیکن ان کی شعر گوئی ان کی نثر نگاری سے کم نہیں، یہ اس مجموعہ کلام سے ظاہر ہے، ان کے سخن کے گلابوں میں رنگ کس کا ہے اس کا راز انہوں نے یہ کھولا کہ ع

جو فکر شعر میں پہروں لہو جلایا ہے تو رنگ رنگ ہوا ہے مرے سخن کا گلاب

اشعار کے مجموعوں کی کثرت میں فکر کی تازگی، واقعی بھلی لگتی ہے، غزل کے پیرایہ میں تاریخ، سائنس، سیاست کے مضامین پیش کرنا اور اس طرح کہ غزل کی روایتی لطافت پر آنچ نہ آئے، یہ اس مجموعہ کی امتیازی خوبی ہے، آگہی کے متوازن عرفان سے شاعری، شاعری ہوتی ہے، قافیہ پیمائی نہیں ہوتی، پڑھنے والوں کو اس مجموعہ سے یہ احساس ضرور ہوگا۔

شب چراغ : از جناب رہبر تابانی دریابادی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۰۸، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: رہبر تابانی، محلّہ چھیپی، دریاباد، ضلع بارہ بنکی اور بزم الفقر، ۱۳۲، سراؤگی، بارہ بنکی۔

آبلے، آبگینے اور حرمین جیسے پاکیزہ شعری مجموعوں کے بعد قادر الکلام شاعر کا یہ مجموعہ روشن تر بن کر آیا ہے، شاعر کا سلسلہ فکر جناب شفیق جونپوری سے ہے، مضامین کی بلندی، زبان کے معیار اور غزل کی پاکیزہ روایت کی پاس داری، ان کی شاعری کی جان ہے، نعت کا یہ شعر ان کی سخن سنجی کا مقام متعین کرتا ہے کہ

کر کے مجھ نا معتبر کو معتبر میرا رسولؐ حرف مہمل کو مفاہیم و معانی دے گیا

غزل کا کیسا پیارا شعر ہے: یاد اس کو دلایا جو کبھی وعدۂ فردا بے درد نے برجستہ کہا بھولے نہیں ہیں
زبان کی لذت و لطافت بلکہ احساس کی سرشاری کے لیے اس مجموعہ کا مطالعہ، حسن ذوق کی دلیل کہا جائے گا۔

ع - ص

رسید مطبوعہ کتب

۱- **آئینہ خانہ:** کوثر پروین کوثر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی۔ قیمت: ۲۰۰ روپے

۲- **اشک ندامت:** قاری انیس احمد پرخاصوی، مکتبہ دار المعارف الٰہ آباد۔ قیمت: ۱۰۰ روپے

۳- **ثنائے جمیل:** ڈاکٹر محمد شہاب الدین، ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔
قیمت: ۸۰ روپے

۴- **روزن ودر:** ساحل احمد، اردو رائٹرس گلڈ، الٰہ آباد۔ قیمت درج نہیں

۵- **شاخ گل:** خمار سہارن پوری، کتب خانہ امدادیہ بازار، خانی باغ، سہارن پور۔
قیمت: ۲۰۰ روپے

۶- **شمار چھالوں کا:** مظفر اعظمی، ۱۱۱۷، مقیم منزل، عارف گارڈن کے سامنے، ناسک روڈ، بھیونڈی۔
قیمت: ۲۵۰ روپے

۷- **طوبیٰ:** تابش مہدی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دعوت نگر ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔
قیمت: ۱۵۰ روپے

۸- **عرش غزل:** علیم صبا نویدی، ٹمل ناڈو، اردو پبلی کیشنز، چینائی۔ قیمت: ۴۵۰ روپے

۹- **کسک:** ہریندر گیری شاد، کھجوتی ہاؤس، ویسٹ دگھی تالاب، گیا۔ قیمت: ۵۵ روپے

۱۰- **کلیات زاہد:** علامہ ابوالمجاہد زاہد، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دعوت نگر ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ قیمت: ۱۳۰ روپے

۱۱- **محمود الوراء:** محمد ہارون الرشید ارشد، بک لینڈ، ۱۶/اردو بازار لاہور، پاکستان۔ قیمت درج نہیں

۱۲- **مرکز نور:** ضیاء الدین ضیاء الٰہ آبادی، اتر پردیش اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن B-518، کریلی، الٰہ آباد۔ قیمت: ۱۰۰ روپے

۱۳- **نقوش عصر:** ملک تاسے، مدنی گرافکس، شاپ نمبر ۵، انامئے بلڈنگ، ۳۰۵، سوموار پیٹھ، پونے۔ قیمت: ۱۵۰ روپے